# گردبادِ حیات

محمد عباس قریشی

# انتساب

اپنی مقدس اور بہادر والدہ محترمہ کے نام
جنھوں نے ہم سب بہن بھائیوں کو عاجزی، انکساری، جرأت اور بے خوفی کے ساتھ
زندہ رہنے کا سبق ازبر کرایا۔

# فہرست

# کچھ مصنف کے بارے میں

جناب محمد عباس قریشی صاحب میرے ہم جماعت اور انتہائی معتبر دوست ہیں اور انھوں نے مجھے اچھے خاصے امتحان میں ڈال دیا ہے۔ بلاشبہ میں عباس قریشی صاحب سے اٹوٹ دوستی کا دعویدار ہوں لیکن انھوں نے جس طرح اپنی چھپی ہوئی صلاحیت کا اظہار کیا ہے میں یقیناً بہت حیران ہوا ہوں۔ پنجاب یونیورسٹی میں گزرے چھ سات سال اور اس کے بعد بھی جب تک رفاقت اور روابط رہے میرا نہیں خیال کہ ہم سب نے یہ سوچا بھی ہو کہ ہم میں سے کبھی بھی کوئی اس میدان میں طبع آزمائی کرے گا یعنی کتاب لکھے گا اور پھر عباس قریشی صاحب کتاب لکھیں گے، یہ بات کبھی بھی ذہن میں نہیں آئی۔ لیکن عباس قریشی صاحب نے ہم سب کو حیران کر دیا ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ہم لوگ دوران لڑکپن اپنے دوست کی صلاحیتوں سے بے انتہا متاثر تھے خاص طور پر ان کی ہمت، استقامت، جدوجہد، مستقل مزاجی اور جستجو چاہے وہ کرکٹ

کے میدان میں ہو جو کہ ان کی دیوانگی اور چاہت میں سب سے بڑھ کر تھی یا ہمارے ساتھ ٹیبل ٹینس کھیل رہے ہوں یا کوئی بھی کھیل حتیٰ کہ پڑھائی میں بھی یہ جنونی ہو جایا کرتے تھے۔ ہم سب جو ہم خیال دوستوں کا ایک گروپ تھا اُن کے اِس جنون کا مختلف مواقع پر مختلف طریقے سے مذاق اڑایا کرتے تھے، ان کو ٹارگٹ کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ان کو گھیرنے کے لیے سب آپس میں مل جاتے تھے لیکن وہ اسی طرح جنونی طور پر ہمارے ساتھ کھیلتے تھے۔ ہم کسی بھی طور ان کے مقابلے کے کھلاڑی نہیں تھے لیکن بس ایسے ہی اٹکل پچو کھیلتے تھے۔ اکثر روندی مار لیا کرتے تھے اور اپنے تیئں ان کو خوب تنگ کیا کرتے تھے۔ یہ ان کی خوبیاں تھیں کہ وہ جنون کی حد تک اپنے شوق سے لگے رہتے تھے۔ پڑھائی، کھیل یا جو بھی کر رہے ہوتے لیکن کتاب لکھ کر تو انھوں نے یقیناً ہم سب کو حیران بھی کر دیا ہے اور پشیمان بھی۔ ان کی پہلی کتاب پڑھنے کے بعد مجھے انسانی زندگی کے دو خواص کا سامنا کرنا پڑا، ایک رشک اور دوسرا حسد۔ رشک اس اعتبار سے کہ انھوں نے بے انتہا اچھا کام سر انجام دیا ہے۔ مجھے رشک ہے کہ انھوں نے کتاب لکھی۔ حسد اس بات پہ کہ میرا یہ خیال تھا کہ ہم چار، پانچ دوست ہیں اور عباس قریشی صرف میرے دوست ہیں اور اسی پرانے گروپ کے ہی ممبر ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی پوری زندگی میں کوئی دوستی نہیں اور کوئی دوست بھی نہیں ہے لیکن جب میں نے ان کی پہلی کتاب ''جدوجہادِ زندگانی'' پڑھی تو مجھے احساس ہوا کہ میں کہیں بہت پیچھے رہ گیا ہوں جبکہ انھوں نے بہت سے اچھے قابلِ ذکر اور

قابلِ رشک دوست اپنی زندگانی میں ڈھونڈے ہیں اور ان کے ساتھ پورا اترے اور وہ دوست بھی ان کے ساتھ دوستی میں پورے اور کھرے اترے ہیں۔ یہ بات کسی حد تک مجھے حسد میں مبتلا کر گئی۔

اب آتے ہیں قریشی صاحب کی لکھنے کی صلاحیت کی جانب، تو یقیناً ایک دفعہ پھر سے یہ بات حیران کن ہے۔ بے شک ہم لوگ بچپن سے کتابیں پڑھنے کے سحر میں مبتلا رہے ہیں، جیسے عباس قریشی صاحب نے بھی لکھا ہے کہ اس ایرا یعنی کہ اُس دور میں طلسمِ ہوش ربا، داستان امیر حمزہ، ابن صفی، سب رنگ اور دوسرے ڈائجسٹ اور دوسری شفیق الرحمٰن، کرنل محمد خان اور سب اسی قبیل کی کتابیں پڑھتے رہے ہیں لیکن لکھنا اور اس خوبی سے، اتنی سلاست سے، اتنی سادہ زبان سے کہ وہ سب اپنے قارئین اور قاری کو مسحور کر دیتا ہے۔ ان کی پہلی کتاب جو تقریباً ساری جیالوجی کے بارے میں ہے وہ اتنی آسان اور سلیس زبان میں لکھی ہوئی ہے کہ وہ لوگ جن کا جیالوجی سے کوئی تعلق نہیں یا یونیورسٹی سے کوئی تعلق نہیں اور ذاتی طور پر یہ کہ وہ عباس قریشی صاحب کو نہیں جانتے، وہ سب بھی اس کتاب کے سحر میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ویلڈن عباس قریشی، تھینک یو!

ضمیر الاحسن

کینیڈا

# حرفِ چند

جناب عباس قریشی میری ساتھ والی گلی میں رہتے ہیں، ہم اکثر ایک ہی مسجد میں نماز ادا کرتے ہیں۔ ایک ساتھ دوسروں کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں، ایک دوسرے کے دکھ درد کو سمجھتے ہیں اور باہمی احترام کا رشتہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ہم جس سوسائٹی میں مقیم ہیں یہ زیادہ پرانی نہیں۔ ہم لوگوں نے اسے آباد ہوتے دیکھا اور اب اسے گنجان آباد ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ پہلے آبادی افقی سمت میں ہوئی تھی، اب عمودی سمت میں ہو رہی ہے۔ پہلے یہاں ہم جیسے آباد ہوئے تھے۔ اب امیر امراء آباد ہو رہے ہیں۔ یہ لوگ ملنے ملانے سے گریز کرتے ہیں۔ ہم بھی ان کے گریز کا احترام کرتے ہیں۔ یہ جیالوجی کے ڈسپلن کے شخص ہیں اور میں ادب کا طالب علم۔ یہ لوگوں کو تعمیر کے معاملات میں مشورہ دیتے ہیں۔ میں اپنی بے خبری اور ان معاملات سے بیزاری کا اظہار کیے بغیر نہیں رہتا۔ یہ زمین، موسم، تعمیر اور انسانی ضروریات کے باہمی ربط پر بات کرتے ہیں۔

میں مکانات کے کولونیل ڈیزائن سے اپنے اختلاف کی تفصیل پیش کرتا ہوں۔ یوں کہہ لیں ہم دونوں میں اتفاق و اختلاف کے کئی امکانات موجود ہیں۔ یہی بو قلمونی ہماری دوستی کی بنیاد ہے۔

عباس قریشی روایتی فکر کے ساتھ پروان چڑھے۔ یہ اپنی رائے اور رویے کو بہت جرأت کے ساتھ پیش کرسکتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے نہ کسی کی شہرت اور بڑائی سے مرعوب ہوتے ہیں، نہ تعلقات اور تکلفات کا لحاظ کرتے ہیں، مگر اچھی بات یہ ہے کہ یہ دوسروں کی باتیں دھیان سے سن لیتے ہیں۔ ان پر غور کرتے ہیں۔ اگر ذہن اور ضمیر مطمئن ہو جائے تو مان بھی لیتے ہیں۔ گویا یہ سوچنے سمجھنے والا دل و دماغ رکھتے ہیں۔ ہمارے عہد اور ہمارے معاشرے میں یہ بات بہت غنیمت ہے۔ اس لیے ان سے مکالمہ ممکن ہے۔ دراصل ہمارے نصابوں اور ہماری کتابوں میں ہر بات اس یقین سے بیان کی جاتی ہے جو صرف جہالت کو میسر ہے۔ ان باتوں کو ہمارے ہاں ایمان کی سطح پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ سماجی علوم میں تحقیق کا سفر مسلسل آگے کو بڑھ رہا ہے۔ بہت ساری ماضی کی باتیں حرف غلط ہو چکی ہیں، مگر ہمارے ہاں مطالعہ پاکستان کے متن میں ایک لفظ کی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہ نصاب ہماری نسلوں کو جس سطح پر فائز المرام کررہے ہیں، اس سطح کے لوگوں سے مکالمہ کسی طرح ممکن نہیں۔ ایسے میں وہ شخص کس قدر غنیمت ہو گا جس سے مکالمہ اور مباحثہ کیا جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ عباس صاحب میرے دل

کے قریب بسنے والے افراد میں سے ہیں۔

عباس قریشی کا تخصّص جیالوجی ہے۔ ان کی ملازمت کا تعلق بھی اسی نوعیت کے کام سے تھا۔ یہ ویرانوں میں ڈیرے ڈالتے، دنوں کو زمین کی تہوں کو کھوجتے اور راتوں کو آسمان کا مشاہدہ کرتے، ویرانوں میں اپنے آپ سے ملاقات کا موقع بھی ملتا ہے۔ انھوں نے یہ موقع ضائع نہیں کیا۔ اپنی تنہائیوں میں خود سے ہمکلام بھی ہوئے اور اپنے رب ذوالجلال سے بھی ہمکلام ہوئے۔ سجدہ ریز بھی ہوئے اور تلاوت و اذکار میں مصروف بھی رہے۔ اوراد و وظائف سے شغف رکھا۔ تلاوت کلام مجید سے حفظ تک کا سفر کیا۔ اب ریٹائرمنٹ کے بعد مطمئن زندگی کرتے ہیں اور سوچتے ہیں شادم زِکار خویش کہ کارے کردم۔

جو بندہ زندگی کے گزرے سالوں سے مطمئن ہو، وہ انھیں یاد کرتا ہے۔ اس کے لیے یادِ ماضی عذاب نہیں ہوتا۔ وہ گزری عمر کے مہکتے لمحوں کو پھر سے جینے کی کوشش کرتا ہے۔ ماضی کی یادوں کو یاد کرنا اور گزری باتوں کو دہرانا، ان کا ذکر کرنا ماضی کو ایک بار پھر سے جینے کی کوشش ہے۔ عباس قریشی وہ خوش قسمت شخص ہیں جو ماضی کو دہرا رہے ہیں، اسے یاد کرتے ہیں۔ ایک طرح سے اسے دوبارہ جینے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے پہلے اپنے کیریئر کا قصہ کہا تھا اور اپنی سروس کے آغاز سے اختتام کی کہانی سنائی تھی۔ اب اپنی بقیہ زندگی کی کہانی سنائی ہے۔ اس کتاب میں وہ اپنے والدین کا، دوستوں کا، اپنے ممدوحین اور محسنوں کا

ذکر کرتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ان کے والدین نیک، دیندار، خوش اخلاق اور شفیق تھے۔ انھوں نے اولاد کو رزقِ حلال کھلایا اور صدقِ مقال کا سبق دیا۔ انھوں نے بڑے ہو کر تعلیم اور کھیل کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ تعلیمی زندگی کی آخری منزل پر پہنچے تو یہ اس موڑ سے آگے نکل چکے تھے جہاں سے راستہ کھیل کو جاتا تھا۔ ان کی آخری تعلیمی ڈگری جیالوجی کی تھی۔ انھوں نے تعلیم کے بعد اپنے علم کو بھلانے کا کام نہیں کیا، بلکہ اپنے علم کو آگے بڑھایا۔ اس میں تمام عمر کام کرتے رہے اور اپنے علم میں اضافہ کرتے رہے۔ ان کا علم ان کے سینے میں ہے، ان کے نوٹس میں نہیں ہے۔ ان کا رشتہ طبعی علوم سے ہے اور بہت گہرا ہے۔ یہ رشتہ تمام عمر کا ہے اور ان کے رگ وپے میں زندہ ہے۔ بقول شاعر:

همه عمر باتو قدح زدیم و نه رفت رنج خمارِ ما
چه قیامتی که نمی رسی زکنار ما بکنار ما

بیدلؔ

عباس قریشی نے زندگی میں بہت کچھ پایا، بہت کامیابیاں حاصل کیں، بہت عزت سے زندگی بسر کی۔ انھوں نے یقیناً بعض جگہ ناکامی کا سامنا کیا تھا، بعض دوستوں کی محبت سے محروم رہے، بعض محرومیوں کا سامنا کیا، مگر شکوہ شکایت سے گریزاں رہے۔ وہ بنیادی طور پر شکر کرنے والا دل رکھتے تھے۔ وہ خوش ہیں کہ انھوں نے کامیابیاں حاصل کیں۔ وہ خوش ہیں کہ عزت پائی۔ وہ

خوش ہیں کہ خیر اور صداقت کی قدروں کو پاسکے۔ یہ ان کا رویہ ہے جو اس کتاب، بلکہ ان کی ہر تحریر میں جلوہ گر ہے۔ وہ کسی شخص کا ذکر کرتے ہوئے منفی پہلو کی تلاش نہیں کرتے۔ وہ کسی کی کمزوریاں نہیں ڈھونڈتے۔ وہ کسی کے باطن میں تانک جھانک کی کوشش نہیں کرتے۔ اس لیے ان کے ہاں ہر شخص کے بارے میں سامنے کی باتیں ہو سکتی ہیں، منفی باتیں نہیں۔ وہ کسی شخص کے بارے میں مشہور باتیں بیان کرنے پر اکتفا تو کر سکتے ہیں، کسی کی زندگی کے تاریک پہلو کا تذکرہ نہیں کرتے۔ کسی کی زندگی کی برائیاں بیان نہیں کرتے۔ اس سے قاری کو نفسیاتی تجزیے اور تحقیقی جائزے کا مواد نہ ملے، مگر مثبت قدروں کا شعور ضرور ملے گا۔

آج ہمارا معاشرہ تیزی سے بدل رہا ہے بچوں بڑوں نے موبائل تھام رکھے ہیں، وہ عموماً موبائل سے علمی و ادبی وڈیوز نہیں دیکھتے، نہ گوگل سے کتابیں پڑھتے ہیں، بلکہ گیم کھیلنے میں مصروف نظر آتے ہیں یا لایعنی گپ شپ کرتے ہیں۔ اس طرح کی زندگی ذہن و فکر کو منتشر کر رہی ہے۔ کھیل اور کتاب ذہن و ضمیر اور فکر و نظر میں یکجائی اور یک رخی پیدا کرتے ہیں۔ ہمیں کبھی اس پر اعتراض تھا کہ لوگ کتابوں کے ڈھیر کے مقابلے میں ڈگری کے کاغذ کو فوقیت دیتے ہیں۔ اب یہ پریشانی ہے کہ کتاب اور کھیل کے مقابلے میں موبائل پر گیم ترجیح پا رہی ہے۔ یہ سرگرمی انتشارِ فکر و ذہن کو بڑھا رہی ہے۔ اس کا ایک ہی

حل ہے کہ کتاب کلچر کو فروغ دیا جائے۔ اپنے تجربات آنے والی نسلوں کو سنائے جائیں، اس سے ارتکازِ ذہنی پیدا ہو گا۔ عباس قریشی نے خود کو کتاب کلچر کے فروغ کے لیے خود کو وقف کر کے ایک ایسا کام کیا ہے جو کسی کارنامے سے کم نہیں۔ میں تہہ دل سے انھیں خوش آمدید کہتا ہوں اور ان کی کتاب کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

والسلام

امجد علی شاکر

لاہور

19 ربیع الاول 1446

# تمہید

دنیا بھر کے فلاسفر، مفکر اور انسانی اقدار کے ماہر انسانی زندگی کے بارے میں طرح طرح کے خیالات و نظریات رکھتے ہیں اور جہاں موقع ملے اپنے افکار کے حق میں بے شمار توجیہات پیش کرتے ہیں۔ کئی ایک اس (انسانی زندگی) کا ایک رخ پسند کرتے ہیں اور اس کو اجاگر کرنے میں اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دیتے ہیں جبکہ کئی دوسرا رنگ دیکھتے ہیں اور اس کی تشہیر میں اس کے حق میں تلاشِ بسیار کے بعد فکر و نظر کے رنگ بکھیرتے نظر آتے ہیں۔ غرض جب سے انسانی تہذیب و تمدن کی تاریخ ملتی ہے یہ سلسلہ جاری و ساری نظر آتا ہے۔

میں اپنی ابتدائی زندگی میں زیادہ تر کھیل کود میں مگن رہا۔ گو کھیل میں کوئی خاص رنگ تو نہ جما سکا لیکن بحیثیت ایک "چھوٹا" ہونے کے اپنے سے بڑوں کو دیکھتا رہا۔ پھر رواج اور مواقع کے مطابق اپنی تعلیم مکمل کر کے حصول رزق کے لیے نکلا۔ شہر لاہور کو عارضی طور پر خدا حافظ کہا اور سفر کرتا دنیا کو دیکھتا، لوگوں کو ملتا، سنتا اور پڑھتا رہا۔ خوشی غمی دونوں متضاد اور ایک دوسرے کے مدمقابل تھے،

لیکن میں ان دونوں کے درمیان میں شاداں و فرحاں پھرتا رہا۔ میری نوکری میرے لیے انتہائی خوش قسمتی کا باعث بنی کہ اس نے پورا پاکستان، خنجراب سے لے کر کراچی کے ساحل تک کا جغرافیہ، اور ہر قسم کے لوگوں سے ملوادیا۔ الحمدللہ ان 34 سالوں میں پاکستان کے پہاڑی، میدانی، ریگستانی اور ساحلی علاقے اور ان میں رچی بسی طرح طرح کی تہذیبی روایات کی حامل اقوام کے ساتھ مہینوں رہنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ اسی دوران دوسرے ممالک کے سفر بھی کیے اور دوسری تہذیبوں کو بھی دیکھنے کے مواقع میسر آئے۔ سفر میرے نزدیک ایک ایسی درسگاہ ہے جہاں عام سے ذہن اور وقوف رکھنے والا شخص راستے میں پڑی صعوبتوں اور قدرت کی رنگ برنگی دنیا کو دیکھ دیکھ کر، مختلف جگہوں کا پانی پی کر انسانی نفسیات کے بارے میں کافی کچھ جان جاتا ہے۔ گو میرا سفر خالصتاً ایک سیاح کا سفر تو نہ تھا بلکہ مجھے تو جہاں جہاں پہاڑ یا میرا گوہر مقصود چھپن چھپائی کے لیے نظر آتا میں اپنی ٹیم کے ہمراہ اُس کا پیچھا کرتا اور مہینوں بعض اوقات سالوں تک یہ کھیل جاری رہتا۔ اس دوران وہاں کے تہذیبی رنگ دیکھنے کو ملتے اور لوگوں کا رہن سہن سمجھ میں آنے لگتا۔

پاکستان میں بسی ان تمام اقوام کی اپنی اپنی خوشی و غمی، رہن سہن، ادب، آداب، کھیل تماشے اور نثر و شاعری کو اگر میں ایک عام سی equation یعنی مساوات کے ساتھ پرکھوں تو یقین جانیں ان میں کوئی قابلِ ذکر فرق نظر نہیں آتا۔ تمام اقوام کا خوشی میں ایک جیسا رنگ ڈھنگ ہے اور اسی طرح غم کے مواقع

پر تاثرات ایک ہی جیسے نظر آئے۔ ان تمام اقوام میں ایک خاص عنصر جو نظر آیا وہ یہ کہ خوشی میں تو تھوڑا آپے سے باہر ہو گئے لیکن جب بھی غم کا سامنا ہوا تو ایک ہی بات زبان سے ادا ہوئی کہ جیسے اللہ کی مرضی۔ اللہ کو ایسے ہی منظور تھا۔ مجال ہے جو ایک خاص وقت کے بعد تک حالتِ غم میں رہیں یا ماتم زدہ نظر آئیں۔

اسی طرح اپنے سرکاری کام کے دوران کئی ایک منفرد معاملات کا سامنا کرنا پڑا اور ناقابلِ یقین واقعات کا ظہور ہوا۔ ان میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی طاقت، حکمت، نصرت اور اپنی مخلوق کے ساتھ خصوصی محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ ان واقعات میں کچھ ایسے ناقابلِ فہم اور ہولناک واقعات ہیں کہ بعض اوقات دروغ گوئی کا شائبہ ہوتا ہے لیکن یہ سارے واقعات بالکل حقیقت پر مبنی ہیں۔ انسانی فطرت غم اور خوشی کا مرقع ہے لیکن اگر المیہ معاملات کو نکال دیا جائے تو پیچھے بقایاجات نہ ہونے کے برابر رہ جاتے ہیں تاہم تمام غم و اندوہ اور المیہ لمحات کے باوجود اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق اور بندوں پر انتہائی مہربان ہوتا ہے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد سارے معاملات دوبارہ اپنی پرانی ڈگر پر چلتے محسوس ہوتے ہیں۔

ایسے ہی کئی ان گنت واقعات اور حادثات ہیں جن سے میرا واسطہ پڑتا رہا اور زندگی آگے بڑھتی رہی۔ ہر ایک واقعہ کا احاطہ کرنا نہ صرف مشکل ہے بلکہ قارئین کے لیے بوریت کا باعث بننے کا خدشہ بھی ہے، یقیناً ایسے کئی واقعات ہیں کہ قارئین کے ساتھ بھی اسی نوعیت کے یا ملتی جلتی نوعیت کے پیش آتے ہوں گے۔ اس لیے ہر ایک واقعہ کی تکرار مناسب نہیں، لیکن ایک اہم بات جو ان

واقعات کو بتانے کا سبب ہے وہ یہ کہ اصل میں ماں باپ کی اپنی اولاد کے ساتھ محبت اور اس کا عملی مظاہرہ نہ صرف ظاہری و باطنی کوششوں سے بھرپور ہوتا ہے بلکہ روحانی طور پر اس کا مقام باقی تمام سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ اولاد کو کوئی بھی مشکل ان کے سامنے یا پس پشت آجائے، ان کو کسی نہ کسی طرح ادراک ہو جاتا ہے اور ان کی دعائیں جو وہ ہر وقت اپنی ایک ایک اولاد کے لیے کرتے رہتے ہیں، اولاد کے لیے آسمانی ڈھال بنی ہوتی ہیں، یہ ماں باپ واقعی عجیب شے ہیں۔ ان کا اپنی اولاد کے ساتھ جو تعلق ہے وہ نہ سمجھ آنے والی کیمسٹری کی مانند ہے۔ ان کی ڈانٹ ڈپٹ اور ان کی چاہت میں انیس بیس کا فرق ہوتا ہے اور دونوں صورتوں میں اولاد کے لیے فرق محسوس کرنا آسان نہیں ہوتا۔

اس کتاب کے مسودہ کی تیاری کے دوران 19 اپریل 2024 بروز جمعہ، دن کے اوقات میں مجھے سینے پر دباؤ محسوس ہوا جو بعد میں دل کے دورے کی ممکنہ نشانیوں میں بدل گیا۔ ہاتھوں کی حالت اور دیکھنے کی صلاحیت انتہائی غیر ہو گئی اور ماتھے پر ٹھنڈے پسینے اس بات کی نشاندہی کر رہے تھے کہ فوراً ہسپتال جایا جائے۔ ابھی سانس بڑھے ہوئے تھے کہ ماشاء اللہ اتفاق سے دونوں بیٹے گھر میں ہی تھے اور دونوں بہوؤں، بیٹی اور اہلیہ نے آناً فاناً ہسپتال کی طرف رَش کیا اور جس محبت و چاہت اور دل کی گہرائیوں سے مجھے اس مسئلہ سے چھٹکارا دلانے کی سعی کی، مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب میں اور میرے بھائی اپنے والدین کی بیماری میں ان کی صحت کے لیے کرتے تھے۔ ان کی مجھے بچانے کی کوششوں کو دیکھ کر بے ساختہ اطمینانِ قلب

نصیب ہوا اور لبوں پر تبسم آ گیا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کا بے حد شکر بجالایا کہ اس نے اتنی سعادت مند اولاد سے نوازا ہے۔ اگر تھوڑا پیچھے جایا جائے تو یہ بھی یقیناً ماں باپ کی دعاؤں کا سلسلہ ہے جنھوں نے ان کی زندگی کے بعد بھی میرے معاملات کا خیال رکھا ہوا ہے اور مجھے آسمانی امداد سے سرفراز کیا ہے۔

جب میں نے "جد وجہدِ زندگانی" مکمل کی تو کئی معاملات میں اُس کو ادھورا چھوڑا۔ وجہ دراصل اس کتاب کی شروعات و منازل اور اختتامیہ کے مابین ایک رشتۂ خاص کی مناسبت بیان کرنا ضروری تھا۔ اگر مزید تفصیل میں بات کو لے جاتا تو معاملہ زیادہ بکھر جاتا اور اصل نقطۂ نظر موہوم سا رہ جاتا۔ یعنی اصل بات کو سمیٹنا مشکل ہو جاتا۔ اس لیے بہت سے معاملات کو سنبھال کر کسی دوسرے پلیٹ فارم کے لیے رکھ لیا۔

ان معاملات میں کچھ تو غیر طبعی معاملات ہیں۔ ان کا تعلق انتہائی باریک بیں تحقیق، موہوم فلسفہ اور ایک نہ ختم ہونے والی بحث سے ہے۔ زیادہ لمبی چوڑی گفتگو نہیں بلکہ صاف الفاظ میں "خواب" ہیں۔ یقین کیجیے میں ایک عام ڈھیلا ڈھالا مسلمان ہوں جو زیادہ تر عملی محنت و مشقت، موسمی تغیر اور رضائے قدرت پر نہ صرف یقینِ کامل رکھتا ہے بلکہ اس کی تگ و دو اور نشر و اشاعت کے سلسلہ میں کافی زیادہ فعال بھی رہا ہے، یعنی میں شعرِ اقبال رحمۃ اللہ؛

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

کے مصداق اپنی بھرپور زندگی گزارنے کا قائل رہا ہوں۔

میں اس کتاب کا یہ باب خاص طور پر اس معاملہ میں کبھی نہ لکھتا اگر ان معاملات کا میری زندگی میں کوئی خاص تعلق نہ ہوتا۔ خواب تو ہر انسان دیکھتا ہے لیکن اکثر خواب لایعنی اور بے معنی ہوتے ہیں۔ شنید ہے کہ زیادہ تر خوابوں کا تعلق انسان کے شعور اور لاشعور میں پھنسے ہوئے خیالات و واقعات سے جڑا ہوتا ہے یا انسان کی صحت و تندرستی سے متعلق ہوتا ہے۔ میں یقیناً مکمل طور پر وجہ خواب کے بارے میں وضاحت نہ کر سکوں کیونکہ میرا اس میدان میں کوئی میلان، مطالعہ اور مہارت نہیں ہے۔ لیکن یقین کریں جن خوابدیدہ واقعات کا ذکر کرنے جا رہا ہوں اور بعد میں جب ان کی تعبیرات کا معرضِ وجود میں آنا اور جیسے مجسم حقیقت میں مَیں نے دیکھا تو قادرِ مطلق کی لامحدود طاقتوں کا اعتراف ہوا بلکہ حیرانی اس بات پر ہوئی کہ میرا شعوری یا لاشعوری واسطہ دُور دُور تک نہ تھا نہ میں اس قابل تھا یا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھ نالائق اور سر تا پا گناہ میں لتھڑے شخص پر یہ عنایات فرما رہا ہے کہ آنے والے واقعات اور مقامات یا گزرے ہوئے واقعات اور ان کی تشریح بذریعہ خواب کر رہا ہے۔

یہ چند خوابدیدہ واقعات جن کا تعلق میرے بچپن، جوانی اور خاص طور پر عملی زندگی کے ساتھ پیوستہ ہے بالکل اصلی حالت میں پیش کر رہا ہوں۔ ان میں کسی قسم کا کوئی دروغ، ملمع کاری یا خوامخواہ کی بڑھائی چڑھائی نہیں ہے۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ ان خوابدیدہ واقعات کی کمیت، وزن یا تجزیاتی نتائج کو کیسے دیکھتے اور

پر کھتے ہیں۔

ملکِ پاکستان میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان گنت انعامات کی بہار لگائی ہوئی ہے، ہر قسم کے موسم، مزیدار خوشبودار پھل، دوسری زرعی اجناس، زرخیز زمین اور سب سے بڑھ کر انتہائی ذہین لوگ جو ہر معاملے میں اپنی کوششوں کی بدولت جدید اقوام عالم کا مقابلہ کرنے اور ان کے ہم پلہ ہونے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ باوجود نامساعد حالات اور زیر تربیت لیڈر شپ کے کئی معاملات میں کامیابی کے نزدیک۔ ایسا ہی ایک مقابلہ کھیلوں کے میدان میں بھی ہو رہا ہے۔ ہاکی، کرکٹ، سکوائش اور سنوکر، یہ تو وہ کھیلیں ہیں جن میں ملکِ پاکستان ایوارڈ حاصل کر چکا ہے۔ کرکٹ ایک ایسا کھیل ہے جس نے قیامِ پاکستان کے فوری بعد اس ملک کے عوام و خاص میں اپنا اثر و نفوذ پیدا کر لیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس خطۂ پاکستان میں بسنے والی ان گنت اقوام کے درمیان ایک ایسا اخوت کا رشتہ قائم کر دیا جو باوجود کئی پریشان کن اختلافات کے ان کو بکھرنے نہیں دیتا۔ میں بھی ایک زمانہ تک اس کھیل کے حسن و جمال کا شکار رہا اور بغیر کسی مستند کوچ یا راہنمائی کے صرف دیکھتے دیکھتے ہی اس میں اتنا کمال حاصل کیا کہ نیشنل کرکٹ کچھ ہی دوری کی مسافت پر رہ گئی۔ بہر حال اس جنونِ کرکٹ کو بھی اس کتاب کا حصہ بنایا۔

کرکٹ کے کھیل نے مجھے بہت کچھ دیا۔ صبر، استقامت، بہادری اور آخری بال تک لڑنے کی جدوجہد۔ یہ بعد میں میری عملی زندگی میں میرے کام آئیں۔ جیالوجی کا شعبہ جو میری زندگی میں پنپا اور تقریباً 34 سال پیشہ ورانہ ذمہ

داریاں نبھیں، اس میں جو کامیابیاں ملیں وہ سب کسی حد تک کرکٹ کی برکتیں تھیں۔ بعض اوقات بلکہ جب تک چالیس سال کی عمر تک نہیں پہنچا تھا، یہ خیال بہت آتا تھا کہ میں نے کرکٹر نہیں بننا تھا تو میں کرکٹ کیوں کھیلا؟ کیوں اس میں وقت ضائع کیا؟ لیکن جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے بے پناہ کامیابیوں سے نوازا تو اس میں کرکٹ کا حصہ نمایاں نظر آیا۔ مجھ میں صبر، استقامت، بہادری اور جذبہ پیدا ہوا جو میری زندگی کی بنیادوں اور دیواروں میں پختگی پیدا کرتا رہا۔

میں دوسروں کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا کہ انھیں ان کی زندگی میں کن کن نامور شخصیات سے ملنے یا ان کو دیکھنے اور سننے کے مواقع میسر آئے، لیکن مجھے باوجود ایک محدود علاقہ اور محدود وسائل کے کئی اہم اور نابغۂ روزگار شخصیات سے ملنے کا موقع ملا۔ میں سمجھتا ہوں اس میں میری طرف سے کسی قسم کی کوئی کاوش نہ تھی، یہ صریحاً اللہ تبارک و تعالیٰ کی خصوصی مہربانی تھی کہ مجھے اپنے وقت کے کئی بلند پایہ دینی مفکر، بانیانِ جماعت اور اسلامی فلسفہ کے علم بردار رہنماؤں سے ملنے کا اتفاق ہوا، بلکہ کئی ایک سیاسی و مقبول رہنما مثلاً جناب ذوالفقار علی بھٹو، آصف علی زرداری صاحب اور چیف آف آرمی سٹاف جنرل راحیل شریف اور جنرل باجوہ جیسی نامی گرامی شخصیات سے ملاقات اور بالمشافہ مصافحہ کرنے کا موقع ملا۔

اس باب میں جن جن شخصیات کو ملنے ملانے کا موقع ملا، ان کا ذکرِ خیر صرف اس حد تک ہے کہ ان کے ساتھ ہونے والی ملاقاتیں اور ان کی شخصیت کے اس وقت کے عادات و فضائل بیان کیے جائیں۔ باقی رہا ان کے اپنے خیالات و

نظریات یا ان کا عملی زندگی میں جھکاؤ، اس کے بارے میں میرا قلم بالکل خاموش ہے۔ یہ ضروری بھی نہیں کہ جن نامی گرامی شخصیات کے ساتھ تعارف ہو، بندہ ان کے خیالات و افکار کو پسند بھی کرتا ہو، لیکن جہاں تک ان کی شہرت جو لازماً قدرت کا ہی عطیہ ہے، کا تعلق ہے، ان سے ملنے کے مواقع دستیاب ہونا میرے نزدیک خوش نصیبی کے مصداق ہے۔

والسلام
محمد عباس قریشی

باب اوّل

# خاندانی پس منظر و ولادت

## ماں کی تڑپ

صبح چھ ساڑھے چھ بجے کا وقت، سردیوں کے ایام، خاتونِ خانہ فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد ناشتہ کے لیے چولہا تیار کرتے ہوئے، لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کچی مٹی سے تیار چولہے میں جلانے کی کوشش میں مصروف اور کسی حد تک کامیاب کہ دھواں پیدا ہوا اور اوپر کو اٹھنے لگا۔ پاس ہی رکھی ہوئی دھونکنی اٹھائی اور پھونکنا شروع کر دی۔ معمول کی کوشش کے بعد دھوئیں نے آگ پکڑ لی اور ناشتہ تیار کرنے کی ابتدا ہوئی۔ ایک بڑے سے برتن میں چائے کے لیے پانی، دودھ اور پتی اکھٹے ہی ڈال دیے گئے۔ جب تک چائے اپنے پہلے ابال کی طرف آئے، آٹے کی پرات میں لبالب آٹا بھر کر اس کو گوندھنا شروع کیا اور کمال مہارت سے سات آٹھ نفوس پر مشتمل ایک متوسط خاندان کے لیے پراٹھوں کا سامان تیار ہو گیا۔ اسی اثنا میں چائے کے دو تین ابال آئے اور چائے کی سوندھی

سوندھی خوشبو چار سو پھیل گئی جو اس بات کا مظہر تھی کہ ناشتہ تیار ہے۔ چنانچہ گھر کے سربراہ اور بزرگوں کو ناشتہ پیش کرنے کے بعد سکول جانے والے بچوں کی چائے پراٹھے سے تواضع کر کے سکول روانہ کیا گیا۔ اب خاتونِ خانہ نے تمام جھوٹے برتن سمیٹے اور گھر کے کونے میں نصب سرکاری پانی کی ٹوٹی کے قریب جمع کیا۔ ان کو اور ساتھ میں رات کے جھوٹے برتنوں کو اکٹھا دھونا شروع کر دیا۔ برتن پھر سے صاف اور چمکدار ہو گئے اور ان کو ان کے ٹھکانے پر سجا کر کمرے میں بچھی چارپائیوں اور ان پر بچھے بستروں کو سمیٹنا شروع کر دیا۔ ایک چارپائی کو اپنے سائز اور بناوٹ کے لحاظ سے باقی چارپائیوں پر فوقیت حاصل تھی۔ اس پر بستروں خاص طور پر رضائیوں کو اوپر تلے سلیقے سے رکھنا شروع کر دیا۔ اس کام سے فراغت کے بعد پورے گھر کی صفائی جو اس وقت تک ایک کھلے صحن اور تین عدد کمروں کے علاوہ بیٹھک پر مشتمل تھا، شروع کر دی گئی۔ کمروں کی صفائی اس لحاظ سے مشکل نہیں تھی کہ وہ پکے فرش والے تھے۔ اس لیے کسی خاص زور آزمائی کے بغیر جھاڑو کا عمل ہو رہا تھا۔ بعد میں گیلے کپڑے کی مدد سے پوچا بھی آسانی سے لگ جاتا تھا۔ مشکل پیش آتی تھی برآمدہ اور صحن میں جہاں اینٹوں کا فرش ہوتا تھا اور ایک دفعہ جھاڑو سے صفائی کے بعد اس سارے فرش کو پانی سے دھویا جاتا تھا۔ بہرحال خاتونِ خانہ نے یہ سارے صفائی والے معاملات جفاکشی سے نبٹائے اور گذشتہ شام کو جو سبزی خریدی تھی، اس کو دوپہر کے کھانے کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا۔

ایک عجیب سی پریشانی جو ابھی چھپی ہوئی تھی، مگر دل و دماغ سے اس کا وجود پنہاں تھا وہ بار بار دل کو ہلکا ہلکا اٹھا بٹھا رہی تھی۔ خاتونِ خانہ سمجھی کہ شاید روٹین کے کام میں کوئی کمی رہ گئی ہے، کوئی کام نامکمل رہ گیا ہے، اس لیے ایسا محسوس ہو رہا ہے لہٰذا سبزی کاٹنے کے عمل کو شروع کرنے سے قبل روزمرہ کے تمام کام کاج پر ایک طائرانہ نظر دوڑائی۔ سارے برتن صاف ہیں اور قرینے سے رکھے ہوئے ہیں۔ بچوں اور بڑوں کے دھونے والے کپڑے بھی اکٹھے کر کے گھر کی لانڈری میں رکھ دیے ہیں جبکہ دھونے کی باری دوپہر کا کھانا پکانے کے بعد آئے گی۔ جھاڑو پوچے میں بھی کوئی کسر نہیں ہے لیکن کیا وجہ ہے کہ دل کی دھڑکن نامعلوم وجہ سے معمول سے ذرا زیادہ ہے۔ ایک انجان سی پریشانی کا دورہ بار بار فکر مندی کی طرف لے کر جا رہا ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے اور دھوپ کی حدت آرام دہ ہو رہی ہے اور روشنی میں اضافہ ہو رہا ہے، خاتونِ خانہ کی حالت گھبراہٹ اور بے چینی کے گرداب میں غیر سے غیر ہو رہی ہے۔ مسئلہ کیا ہے اور کہاں ہے، خاتونِ خانہ بار بار متلاشی نظروں سے اپنے ارد گرد دیکھتی ہے۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آتا کہ آخر بات کیا ہے۔ تینوں کمروں میں بار بار جاتی ہے اور بیٹھک بھی اوجھل نہیں رہی کہ شاید کوئی بات یاد آ جائے کہ کیا وجہ ہے کس چیز کی کمی ہے کہ موجودہ حالت جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی کیونکہ وجود میں آئی۔

اس اثنا میں ساتھ والے گھر سے ایک شیر خوار بچے کے رونے کی آواز آتی

ہے اور ساتھ ہی خاتونِ خانہ کا انجانا خوف پہلے پہل سر اسیمگی میں بدلتا ہے اور بعد میں ان پر ایک طرح کی وحشت طاری کر دیتا ہے۔ خاتونِ خانہ بے چینی، انجانے خوف اور سر اسیمگی کی وجہ جان جاتی ہیں اور ساتھ ہی سانس دھونکنی کی مانند، چہرہ زرد، آنکھیں خوف زدہ اور ہاتھوں میں کمزوری، قریب ہے کہ نڈھال ہو کر فرش پر گر جائے، لیکن مذہب کے ساتھ والہانہ لگاؤ بھی ہے اس لیے اتنی ہوش ہے کہ اپنے اللہ کو اپنی مدد کے لیے پکارے۔ 'ہائے میرا بچہ!' بمشکل یہ الفاظ منہ سے نکلے اور تقریباً سال بھر کی عمر کے اپنے شیر خوار بچے کو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ جیسے ہی خاتونِ خانہ کو یاد آیا کہ ان کا بچہ کہیں بھی نظر نہیں آرہا، دل کی دھڑکن کی رفتار اور آواز بلند ہونا شروع ہو گئی۔ خاتونِ خانہ بھاگی، پورے گھر کو دیکھا۔ سارے کمروں، بیٹھک، یہاں تک کہ بیٹھک کی الماری کو بھی دیکھنا شروع کر دیا کہ شاید سال کا بچہ ہے الماری کھول کر اندر نہ بیٹھ گیا ہو۔ اگر اندر بیٹھ گیا اور الماری بند ہو گئی ہو تو۔۔۔۔ آگے سوچنا اور نتیجہ اخذ کرنا ایک ماں کے بس کی بات نہیں تھی۔ لپکنا، پلٹنا، اِدھر دیکھ، اُدھر دیکھ، سارا گھر دیکھ لیا۔ خوف و وحشت کی فضا اپنی انتہا پر۔ اب کی بار زبان خشک، آواز بند سارے گھر میں اکیلی ایک بیچاری ماں اپنے بچے کو ڈھونڈ رہی ہے۔ بچہ مل نہیں رہا۔ اپنے ہی گھر میں بچہ غائب ہو گیا۔ بچے کی بھوک کا وقت ہو گیا تھا شاید یہ بھی وجہ تھی کہ جب ماں نے بچے کو دودھ پلانا تھا اور قدرت کے وہ تمام معاملات جو بچے کی بھوک کی وجہ سے اس کو رونے پر مجبور کرتے ہیں اور ماں کے دودھ اترنے اور پلانے والے عوامل یکجا ہو گئے تھے۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا خاتونِ خانہ کی پریشانی اور وحشت میں اضافہ ہوتا گیا، تمام گھر کو اچھی طرح کھنگال لیا۔ اب ٹیلی فون میسر نہیں اور موبائل کا زمانہ تو تھا نہیں کہ اپنے میاں کو یا کسی عزیز رشتہ دار کو اطلاع کرتیں اور مدد کے لیے بلاتیں۔ خود ہی تمام تر مشکل اور عذاب ناک صورتحال کو برداشت کرتی رہیں۔ اس دوران بچہ کی تلاش میں بڑی چارپائی کے پاس پہنچیں اور اس پر ڈھیر نما رضائیوں کو دیکھا، تو ٹھٹھک گئیں، کیونکہ تلاش بسیار میں صرف ایک یہی جگہ تھی جو کھنگالی نہیں گئی تھی۔ لیکن چھ سات رضائیوں کا بوجھ اور کم از کم تین یا ساڑھے تین گھنٹے کے لیے، ایک معصوم بچہ اگر ان رضائیوں کے بوجھ تلے ہے بھی تو کیا اس کے سانس جاری ہوں گے؟ کیا وہ زندہ ہو گا؟ سانس رک تو نہیں گیا ہو گا؟ اب کے خاتونِ خانہ کا ضبط جواب دے گیا، ایک موہوم سی امید کے ساتھ دیوانہ وار سب سے اوپر والی رضائی کو کھینچا۔ نیچے گرایا اور پھر خوف و امید کے ساتھ دوسری تیسری اور باقی ماندہ رضائیوں کو اٹھا کر فرش پر گرایا۔ آخری رضائی جب اٹھی تو نیچے ایک سانولا، گول مٹول، بڑی بڑی آنکھوں والا بچہ نمودار ہوا جس نے اپنے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا منہ میں لیا ہوا تھا اور چپڑ چپڑ کی آوازوں کے ساتھ چوس رہا تھا۔ خاتونِ خانہ بچے کو زندہ و سلامت دیکھ کر خوشی کے آنسوؤں سے تر آنکھوں کے ساتھ بے اختیار اس بچے کو تھامتی ہیں، اٹھاتی ہیں، سینے کے ساتھ لگاتی ہیں اور اپنے اللہ کے واری جاتی ہیں۔ یہ بچہ اور کوئی نہیں، میں یعنی محمد عباس قریشی تھا اور خاتونِ خانہ میری والدہ ماجدہ ابرار اختر تھیں۔

## پیدائش اور حصولِ تعلیم

میری پیدائش 16 نومبر 1959 کو رحمان پورہ کوارٹرز وحدت روڈ مکان نمبر E-232 میں ہوئی۔ میرے والدِ محترم جناب رفیق احمد قریشی صاحب ایک متوسط طبقے کے باعزت شہری تھے جو ایک سرکاری ادارے میں ایڈمن تھے۔ میں اپنے والدین کی پانچویں اولاد کا درجہ رکھتا تھا۔ مجھ سے بڑے دو بھائی، ان سے بڑی دو بہنیں تھیں جو میرے والدین کو اللہ رب العزت نے پہلے سے عطا فرمائی تھیں۔ میری پیدائش کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس گھرانہ میں تین بھائی اور ایک بہن مزید عطا کیے۔ ہمارے دادا جان جناب حاجی محمد سعد اللہ قریشی بھی ہمارے ساتھ ہی سکونت پذیر تھے۔ یوں یہ گھرانہ 12 نفوس پر مشتمل اپنے وقت کے حساب سے ایک متوسط اور کھاتا پیتا گھرانہ تھا۔ والد صاحب سرکاری ملازم تھے اور اس گھرانہ کے واحد کفیل بھی لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا یہ حال تھا کہ ہر قسم کی نعمت میسر تھی اور گھر میں تعلیم و تربیت کا سلسلہ بڑے بچے سے لے کر سب سے چھوٹے بچے تک پھیلا ہوا تھا۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو اپنی والدہ کو بڑے بھائی محمد الیاس قریشی صاحب کو اردو کا قاعدہ پڑھاتے ہوئے پایا۔ میری والدہ کے خیال میں مَیں چونکہ ابھی چھوٹا تھا اس لیے مجھے بھائی کے ساتھ بٹھا کر تعلیم کے عمل سے گزارنے والی پابندی سے مُبرّا سمجھا گیا۔ والدہ محترم بھائی صاحب کو اب پ اور اس کے آگے والی اردو پڑھاتیں۔ میں ساتھ ساتھ ہوتا اور میرے کانوں میں اردو کے ابتدائی قاعدہ کے الفاظ مسلسل پڑتے رہتے اور والدہ کے بتائے ہوئے

الفاظ و محاورات کو یاد رکھتا۔ وہ پڑھاتی تو بھائی صاحب کو تھیں لیکن یہ میرے ذہن میں ازبر ہوتے گئے اور یوں بھائی صاحب کے ساتھ ساتھ میں بھی اردو کے قاعدہ کے ابتدائی صفحات کو نہ صرف اچھی طرح پہچان گیا بلکہ اس قابل ہو گیا کہ فرصت کے لمحات میں بھائی صاحب کے قاعدہ کو باقاعدہ پڑھنا شروع کر سکوں۔ یہاں تک کہ پورا قاعدہ بغیر باقاعدہ تعلیم کے پڑھ گیا۔ انھی ایام میں پاکستان اور بھارت کے تعلقات اتنے کشیدہ ہو گئے کہ جنگ کی نوبت آگئی اور 6 ستمبر 1965 کو باقاعدہ پاک بھارت جنگ کا آغاز ہو گیا۔ ہمارے گھر میں ان دنوں روزنامہ "کوہستان" آتا تھا جس میں جنگ کی تمام روئیداد وضاحت کے ساتھ شائع ہوتی۔ دادا جان چونکہ مشرقی پنجاب سے مہاجر ہو کر پاکستان آئے تھے اور اپنے ملک پاکستان سے بے انتہا محبت کرتے تھے، اس لیے وہ اکثر ریڈیو پر یا لوگوں کے ذریعے حالتِ جنگ اور اس سے جڑے معاملات کو بے حد دلچسپی سے سنتے تھے۔ ایک دن کیا ہوا کہ میں نے کوہستان اخبار کی شہ سرخیوں کو پہلے پہل ہجے کر کے اور تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد روانی سے پڑھنا شروع کر دیا۔ دادا جان محترم پہلے پہل تو دل چسپ شہ سرخیوں کو سنتے رہے کہ پاکستان کی بہادر افواج نے دشمن کے دانت کھٹے کر دیے اور محاذِ جنگ میں لاتعداد بھارتی فوجیوں کو مار دیا اور بے شمار ٹینکوں کو تباہ کر دیا۔ پاک فضائیہ نے دشمن کے اتنے جہاز مار گرائے۔ دادا جان حقہ کے دھیمے دھیمے کش لگاتے اخبار سنتے جا رہے تھے کہ یکایک انھوں نے حقہ کی نَے کو ایک طرف کیا اور مجھے غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ پھر اٹھے اپنی

پگ سر پر سجائی اور مجھے بازو سے پکڑا اور بولے: ”چلو۔“ میں تھوڑا حیران ضرور ہوا لیکن میں بھی جھٹ تیار ہو گیا اور دادا جان کے ساتھ گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ ساتھ ہی بازار تھا اور اس بازار میں کئی ایک کریانے کی دکانیں تھیں۔ وہاں دادا جان کے ایک دوست کی دکان بھی تھی جس میں اس کی بیٹی بھی اس کا ہاتھ بٹاتی تھی اور اس دکان کا نام عرفِ عام میں کُڑی والی دکان (لڑکی والی دکان) پڑا ہوا تھا۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ دادا جان نے اس دکان سے ایک عدد اردو کا قاعدہ، ایک لکڑی کی تختی، سلیٹ، سیاہی کی دوات یعنی ابتدائی پڑھائی کے لیے درکار ضروری اشیاء خریدیں اور اپنے رومال میں باندھ کر مجھے ساتھ ہی میونسپل کارپوریشن سکول رحمان پورہ میں لے گئے۔ وہاں پر جو ہیڈ ماسٹر تھے وہ ہمارے محلے دار اور دادا جان کے دوست تھے۔ ان کا بھلا سا نام تھا، ماسٹر حکیم۔ ماسٹر حکیم صاحب سے ملنے کے بعد انھوں نے میرا تذکرہ کیا کہ اسے سکول میں داخل کرنا ہے اور تمام ضروری اشیاء ہمراہ ہیں۔ چنانچہ ماسٹر حکیم (اللہ غریقِ رحمت کرے) کی بتائی ہوئی جماعت میں ہم دونوں دادا پوتا پہنچ گئے اور اس جماعت کے انچارج ماسٹر صاحب سے ملاقات کی۔ بعد ازاں انھوں نے میرا امتحان لیا اور بولے، 'بیٹا قاعدہ کھولو اور اس کو دیکھو اس میں کیا لکھا ہے۔' میں نے فوراً قاعدہ کھولا جو مجھے بھائی الیاس کی وجہ سے پہلے سے ازبر تھا اور مکمل 'الف' تا 'ی' پڑھ کر اگلے صفحہ میں چھوٹے الفاظ بھی پڑھنا شروع کر دیے۔ ماسٹر صاحب نے جب دیکھا کہ بچہ سرپٹ دوڑ رہا ہے تو بولے، 'بس بس، ٹھیک ہے۔ ہم اس بچے کو کچی کلاس کی بجائے پکی کلاس میں

داخل کر لیتے ہیں۔' چنانچہ دادا جان مجھے پرائمری سکول میں داخل کروا کر گھر واپس چلے گئے اور میرا تعلیمی سفر شروع ہو گیا اور پھر ستمبر 65 کی جنگ کے بعد عوامی تحریک کی وجہ سے سکول کچھ دنوں کے لیے بند ہو گیا۔ لیکن یہ سفر شروع ہوا مارچ 1970 تک اسی سکول میں چلتا رہا۔ بعد ازاں گورنمنٹ پائلٹ ہائی سکول وحدت کالونی میں داخلہ ٹیسٹ پاس کرنے کے بعد ششم جماعت میں داخلہ مل گیا اور سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ دسمبر 1971 میں مَیں سقوطِ مشرقی پاکستان وقوع پذیر ہوا۔ والدِ محترم (اللہ غریقِ رحمت کرے) کو گھر کی دیواروں کے ساتھ سر ٹکراتے اور چیخ چیخ کر روتے ہوئے دیکھا۔ بہت ہی غمزدہ ماحول تھا اور وقت مشکل سے گزر رہا تھا۔ یہ جنگ پاکستان ہار گیا اور چونکہ اس جنگ میں بھارت ملوث تھا اس لیے اس کے خلاف جو نفرت ہم پنجابی مہاجروں کے دلوں میں موجود تھی اس میں دوچند اضافہ ہو گیا اور یہ بھی نفرت تھی کہ دل چاہ رہا تھا جیسے تیسے وقت گزرے اور پاک فوج میں شامل ہو کر بھارت سے بھرپور بدلہ لیا جائے۔ 1975 میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج آف سائنس وحدت روڈ میں ایف ایس سی میں داخلہ مل گیا اور یہاں سے 1977 میں ایف ایس سی کا امتحان پاس کر لیا۔ اس عرصہ میں دو مرتبہ پی ایم اے لانگ کورس اور ایئر فورس کے لیے ابتدائی ٹیسٹ وغیرہ پاس کیے، لیکن آئی ایس ایس بی کو کوالیفائی نہ کر سکا جس کا شدت سے غم رہا۔ بعد میں بھی اس ناکامی کو بھلا نہ سکا۔ اس ملک کی خدمت کرنے کا جذبہ دل و جان میں موجود رہا اور بالآخر انسٹیٹیوٹ

آف جیالوجی پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا، جہاں سے 1985ء میں ایم ایس سی جیالوجی کی ڈگری حاصل کی۔

## والدین کی دعائیں اور آسمانی امداد

میں نے جب سے ہوش سنبھالا اور باتوں کو سمجھنا شروع کیا تب سے میرے کانوں میں والدۂ محترمہ اور والدِ محترم کی مانگی ہوئی دعاؤں کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ والدۂ محترمہ تو دعائیں زیادہ تر زیرِ لب مانگتی تھیں لیکن والدِ محترم اللہ تعالیٰ کے حضور بآواز بلند انتہائی عاجزی و انکسار کے ساتھ اپنے ایک ایک بچے کا نام لے کر اور گڑگڑا کر ہر نماز میں بالخصوص نمازِ فجر کے بعد جو دعائیں کرتے وہ ہم سب کو اچھی طرح یاد اور حفظ ہو گئیں۔ اور یہ دعائیں ایک خاص بحر میں سلسلہ وار باترتیب ہوتیں۔ آج تک جب والد صاحب کی دعا کو ادا کرنا ہو تو صرف پہلی دعا ہی زبان پر آتی تو ساری کی ساری دعا جو ازبر ہے وہ فرفر زبان سے ادا ہونے لگتی ہے اور اس وقت تک ہوتی رہتی ہے جب تک آخری جملہ ادا نہیں ہو جاتا۔ اس دعا میں والد صاحب ہم سب کی جان و مال اور ایمان کی حفاظت، صحت و تندرستی اور لمبی عمر کی دعائیں کیا کرتے تھے اور ساتھ ساتھ اللہ کے سوا کسی غیر کے محتاج نہ ہوں، یہ دعا ضرور کیا کرتے تھے۔ اس وقت تو ان دعاؤں اور مناجات کے بارے میں یا ان کی سنجیدگی کے بارے میں کچھ خاص ادراک نہ تھا لیکن کچھ تو والد صاحب کی زندگی میں ہی اور کچھ ان کی زندگی کے بعد ان دعاؤں کے اثرات اور معجزاتی کمالات کا رونما ہونا ان دعاؤں کی فضیلت اور طاقتور ہونے

کا ثبوت دے گیا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میرے پھوپھی زاد بھائی محمد فاروق عرف پاپا اور خالہ زاد بہن باجی کوثر کی شادی ہوئی۔ بھائی فاروق کی والدہ ان دنوں راولپنڈی میں رہائش پذیر تھیں اس لیے بارات تیار لاہور میں ہوئی لیکن اس کی واپسی راولپنڈی میں ہوئی۔ اس وقت میری عمر اندازاً آٹھ سال ہو گی، لاہور سے راولپنڈی واپسی کا سفر کچھ زیادہ یاد نہیں ہے لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ جب پھوپھو کے گھر پہنچے تو یہ رات کا وقت تھا۔ یہ راولپنڈی کا ایک بہت پرانا علاقہ تھا جس کے در و دیوار خصوصاً مرکزی دروازے خالص دیودار لکڑی اور بہترین تراش خراش کا نمونہ تھے۔ گلیاں صاف ستھری اور کسی حد تک کشادہ تھیں لیکن ہر گلی میں ایک ہی بلب بطور سٹریٹ لائٹ کے روشن تھا جس کی روشنی کافی مدھم تھی۔ اب جس گھر میں بارات آ کر ٹھہری، وہ بھی گھر قیامِ پاکستان سے کافی پہلے کا تعمیر شدہ اور اسی خدوخال میں تھا جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ سب سے اہم بات ان تمام گھروں کے مرکزی دروازے تھے جو معمولی فرق کے ساتھ ایک ہی جیسے ڈیزائن اور سائز کے تھے، اور تو اور ان کے رنگ بھی ایک جیسے تھے۔

اب ہوا یوں کہ جب بارات راولپنڈی دولہا کے گھر آئی تو لڑکی والوں نے، جو میری سگی خالہ تھیں، حسبِ رواج کھانا بھی دیا جو دیگوں میں تھا۔ یہ دیگیں غالباً ان بسوں کی چھتوں یا شاید بسوں کے اندر کہیں پیچھے رکھ کے لائی گئی تھیں۔ ہم تمام باراتی تو گھر کی طرف روانہ ہو گئے اور دلہن کو لے کر پھوپھو کے گھر میں داخل

ہو گئے لیکن جہیز کا سامان اور کھانے کی دیگیں میرے تایا زاد بھائی جناب طارق غفیر کی زیرِ نگرانی بسوں سے نکال کر شادی والے گھر میں منتقل ہونا شروع ہو گیا۔

میں تازہ دم تھا، چونکہ راستے میں اپنی نیند پوری کر بیٹھا تھا، اس لیے بطور تجسس اس سارے عمل کو دیکھنے میں محو ہو گیا اور باقاعدہ اس ٹیم کے ساتھ بس سے سامان نکلتا اور گھر میں منتقل ہوتا دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ ایک نزدیکی رشتہ دار نے روکا بھی اور ڈانٹ بھی پلائی کہ تم ادھر گھر میں ہی رکو ہمارے ساتھ مت آؤ، ورنہ شاید تم راستہ بھٹک جاؤ اور کسی مسئلہ سے دوچار ہو جاؤ لیکن میں ماننے کے موڈ میں نہیں تھا اور ہوا بھی یہی کہ ایک بار جب میں اس ٹیم کے ہمراہ کچھ سامان لے کر واپس آ رہا تھا تو ٹیم کی رفتار کا ساتھ نہ دے سکا اور گلی کے بے شمار موڑ والے راستوں میں سے ایک راستے کو اختیار کر لیا جو کہ غلط راستہ تھا اور بجائے میں شادی والے گھر کے کسی ساتھ والی گلی میں داخل ہو گیا۔ اب یہاں پر سٹریٹ لائٹ ویسے بھی مدھم تھی اور اندھیرا زیادہ تھا اس لیے کچھ کچھ ماتھا ٹھنکا کہ یہ تو وہ والا گھر نہیں لگتا جہاں ہم آئے ہیں اور دوسرا یہ معلوم ہوا کہ مرکزی دروازوں کی مماثلت کی وجہ سے ایک ایسے گھر کے باہر رک گیا جو بظاہر تو شادی والے گھر کی طرح ہی تھا لیکن ویسی رونق اور روشنی نہ تھی۔ اور تو اور وہاں بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پہلے پہل میں سمجھا کہ شاید سارا سامان بسوں سے گھر میں منتقل ہو گیا ہے اور سارے مہمان اندر پہنچ گئے ہیں، اس لیے تمام روشنیاں گل کر دی گئی ہیں اور میں اکیلا پیچھے رہ گیا ہوں۔ اس تجسس میں مَیں نے گھر کا دروازہ بھی کھٹکھٹایا اور

اپنے بڑے بھائیوں کو آوازیں بھی دیں لیکن وہاں تو گھپ اندھیرا اور انتہائی خاموشی تھی۔ میں یقیناً ڈر گیا اور سمجھ گیا کہ راستہ بھٹک گیا ہوں۔ گھبراہٹ اور پریشانی کی اس کیفیت نے مجھے خوفزدہ کر دیا۔

اس کیفیت میں مَیں نے اس طرف دوڑ لگا دی جہاں سے میں یہاں آیا تھا۔ اب والد صاحب کی دعاؤں کی کرامت ظاہر ہوئی جو بظاہر اس وقت تو سمجھ نہ آئی لیکن مدتوں بعد جب سوچ بچار کی منزل ملی تو علم ہوا کہ دعائیں خاص کر والدین کی دعائیں بچوں کا پیچھا کرتی ہیں اور ان کو ہر حادثے اور پریشان کن صورتِ احوال سے بچاتی ہیں۔ میرے تایازاد بھائی جناب طارق غفیر اچانک ایک دیگ کو مخصوص طریقے سے گھسیٹتے ہوئے اس جگہ نظر آئے جہاں میں غلطی سے بھول کر دوسری جگہ پہنچ گیا اور بعد ازاں آفتِ ناگہانی میں مبتلا ہوا۔ بہر حال بھائی طارق غفیر نے مجھے دیکھا اور غصے میں بولے، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ چلو ہمارے ساتھ اور میں نہایت شریفانہ انداز میں فرمانبردار ہو کر ان کے ہمراہ ہو لیا۔ تھوڑی ہی دیر میں شادی والے گھر پہنچ گئے جہاں خوب قمقمے روشن تھے اور چہل پہل رونقیں لگی ہوئی تھیں۔ جاتے ہی میں تو والدہ کے ساتھ لگ گیا اور اپنے اندر کے خوف اور دہشت کو اپنی والدہ کے لمس کو محسوس کر کے اطمینان اور بہادری کے جزیرے میں واپس آ گیا۔ اس واقعے کا اتنا خوف اور ڈر تھا کہ میں نے آج تک اس واقعہ کا کسی کے ساتھ بھی تذکرہ نہیں کیا اور میں یوں سمجھتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ میں بھائی طارق غفیر کو نہ دیکھتا یا پا سکتا، کسی خطرناک گروہ کے ہتھے چڑھ جاتا تو

آگے بتانے کو اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور کچھ نہیں۔ یہ میری زندگی کی حفاظت صرف اور صرف میرے والدین کی دعاؤں کے ہی طفیل ہے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ جو میری یادداشت میں قیام پذیر ہے، اس میں مَیں اغوا کرنے والے گروہ سے بال بال بچا۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں، غالباً چھٹی یا ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا، تو ہم سب بہن بھائی گرمیوں کی چھٹیوں کی وجہ سے گھر میں خوب اودھم مچاتے خاص طور پر جب والد صاحب صبح 8 بجے اپنے دفتر میں چلے جاتے اور ہمیں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ ہوتا۔ والدہ محترمہ کسی حد تک ہمیں کنٹرول کرنے کی کوشش کرتیں لیکن ماسوائے بڑی بہنوں باجی طاہرہ اور باجی ریحانہ کے ہم لڑکے بالے ان کے قابو میں نہ آتے اور خوب لڑائی مار کٹائی، شور شرابہ ہوتا۔ ایسے میں والدہ محترمہ غصے میں آکر جو ان کے ہاتھ آ جاتا اس کو اپنے تئیں خوب پھینٹا لگاتیں۔ اب یہ میری شامتِ اعمال سمجھیں یا شرافت کہ میں ہی اکثر ان کے قابو میں چڑھتا اور باقصور یا بے قصور دونوں صورتوں میں مار کھاتا۔ اسی طرح ایک دن صبح سے ہی گرمی کا زور بھی تھا اور ہم بہن بھائیوں کی شوٹنگ کا بھی آغاز ہو رہا تھا۔ اچانک خیال آیا کیوں نہ میدانِ جنگ خالی کیا جائے اور باہر گھوم پھر لیا جائے چنانچہ کسی کے علم میں لائے بغیر میں نے مرکزی دروازہ کھولا اور چپکے سے باہر نکل گیا۔ جیب میں پیسہ ویسہ تو تھا نہیں اس لیے پیدل ہی پہلے وحدت روڈ اور پھر فیروز پور روڈ سے ہوتا ہوا اچھرہ، مزنگ، صفاں والے چوک سے ریگل چوک اور مال روڈ کو کراس کر کے ہال روڈ

پہنچ گیا۔ یہاں پر کچھ مشکوک قسم کی آنکھوں کا احساس ہوا کہ جیسے کوئی دیکھ رہا ہے اور واقعی کوئی میری حرکات و سکنات نوٹ کر رہا تھا۔ تجربہ کار اغواکاروں کو پتا چل جاتا ہے کہ بچہ اکیلا ہے اور بغیر کسی وارث کے کافی دور سے پیدل چل کر آ رہا ہے۔ اب کیا ہوا کہ ایک نوجوان خوش شکل کسرتی جسم کا مالک میرے پاس آیا اور پوچھا بچے کہاں جا رہے ہو؟ میں نے فٹ سے جواب دیا، علی ہجویری کے مزار جا رہا ہوں۔ یہ بات میں نے اپنے تیئں اوور سمارٹ بنتے ہوئے کہی، کیوں کہ حالات کی نزاکت کا اندازہ مجھے بھی ہو گیا تھا کہ اغواکاروں کے گروہ کے ایک رکن کے ہاتھوں چڑھ رہا ہوں اور گھر سے بھی کافی دور ہوں، نزدیک کوئی واقف کار نہیں۔ اب اللہ ہی ہے جو میں خیر خیریت سے یہاں سے نکلوں اور گھر پہنچ جاؤں۔ اسی اثنا میں اس نوجوان نے میرا ہاتھ پکڑا اور میکلوڈ روڈ کراس کرتے ہوئے جو سامنے بلڈنگ ہے، اس کے پاس جا کر بولا، تم یہیں رکو میں ذرا ایک دوست کو مل لوں پھر اکٹھے ہی علی ہجویری کے مزار پر چلیں گے۔ میں اس کی باتوں میں آ گیا اور سر ہلا کر کمال فرمانبرداری کے ساتھ وعدہ کیا کہ ہاں میں یہیں رکتا ہوں، آپ اندر اپنے دوست کو مل آؤ۔ اب یہاں سے والدین کی دعاؤں کا کام شروع ہو گیا اور مجھے آہستہ آہستہ اپنے اندر ہوش اور بیداری محسوس ہونا شروع ہوئی اور جب میں نے دروازے کے آر پار نظر آنے والے شیشے سے دیکھا کہ وہ شخص ایک اور شخص سے پُراسرار طریقے سے بات کر رہا ہے اور ساتھ ساتھ مجھے بھی دیکھ رہا ہے تو میں سمجھ گیا کہ میں تو مشکوک ہی نہیں بلکہ یقیناً

خطرناک گروہ کے کارندوں میں پھنس رہا ہوں اور گھر سے بتائے بغیر بھاگنے والے بچوں کا جو حال ہوتا ہے اس میں مبتلا ہوا ہی چاہتا ہوں۔ بات اچھی طرح سمجھ آنے کے بعد جیسے ہی انھوں نے میری طرف سے نگاہیں ہٹائیں میں نے ہسپتال جانے والی روڈ کی طرف دوڑ لگا دی اور آناً فاناً کسی غیبی قوت کا ساتھ محسوس کرتے ہی دوڑتا ہی گیا اور ہسپتال کو کراس کر کے بانسوں والے بازار سے ہوتا ہوا بائیں طرف بھاٹی دروازے کی روڈ پر چڑھ گیا۔ پھر چونکہ والدین کی دعائیں ہمراہ تھیں اس لیے میں کب بھاٹی دروازے کے باہر براستہ اردو بازار ہوتا ہوا پہنچا اور کب ملک تھیٹر کو کراس کیا اور کب مزار پر پہنچ گیا، کچھ یاد نہیں۔ بس اتنا محسوس ہوا، گھر سے نکل کر بہت بڑی غلطی کر دی ہے۔ بھوک ستانے لگی تو دربار کے باہر لنگر خانے سے ایک نان اور دال لے کر وہیں چوکنا ہو کر بیٹھ گیا اور کھا پی کے دربار کے اندر سے میٹھی پھلیاں جو زائرین بانٹتے ہیں، حاصل کیں، کچھ کھالیں اور کچھ جیب میں رکھ لیں۔ اب معاملہ چونکہ گھمبیر ہو گیا تھا اور اس بات کا خدشہ کہ کہیں وہ اغوا کرنے والے گروہ کے لوگ مجھے تلاش کرتے ہوئے مجھ تک پہنچ نہ جائیں، میں نے واپسی کا راستہ بدل دیا اور دربار سے نکل کر گامے شاہ کو کراس کر کے ناصر باغ سے ہوتا ہوا ایم اے او کالج آگیا۔ یہاں کچھ دیر ستانے کے بعد جین مندر اور پھر فیروز پور روڈ پر آگیا۔ ساتھ ساتھ پیچھے مڑ کر اور چوکنا ہو کر محتاط انداز میں آگے بڑھتا گیا۔ جب اچھرہ موڑ آیا تو جان میں جان آئی اور پھر فیروز پور روڈ کو چھوڑ کر اچھرہ کے اندر گھس

گیا۔ اچھرہ میں آکر کچھ راحت و اطمینان حاصل ہوا اور پھر رحمان پورہ کالونی سے اپنے گھر میں آگیا۔ شام کے تقریباً پانچ بجے تھے جب میں گھر میں داخل ہوا۔ کافی خاموشی تھی۔ والدہ محترمہ انتظار میں تھیں، والد صاحب آ چکے تھے اور سستا رہے تھے۔ میں چپکے سے گھر میں داخل ہوا۔ مٹی سے پاؤں اَٹ رہے تھے اور جو کارنامہ میں کر کے آیا تھا، کسی کو بھی اس کا علم نہ ہونے دیا۔ نہا دھو کر نماز پڑھنے مسجد چلا گیا۔ اب کے ایک بار پھر ماں باپ کی دعاؤں کے طفیل ایک ناگہانی آفت اور اندھیرے مستقبل سے بال بال بچا تھا۔

اب جو واقعہ بیان کرنے کو جی مچل رہا ہے یہ تقریباً ناقابلِ بیان اور انتہائی خوفزدہ کرنے والا ہے۔ میں جب بھی اس واقعے کو یاد کرتا ہوں ایک جھرجھری سی بدن میں محسوس ہوتی ہے اور فوراً اپنا دھیان کسی اور جگہ لے جاتا ہوں کیوں کہ اگر یہ واقعہ وقوع پذیر ہو جاتا تو آگے میری زندگی میں یقیناً ایک گہرا اندھیرا ہوتا اور میرا ذہنی قیام کسی گہری کھائی میں ہوتا۔

والد صاحب نے ہم بھائیوں کو ایک چھرے والی گن (غالباً اس کے چھرے کا سائز 0.2mm کے برابر ہوتا ہے) لا کر دی ہوئی تھی۔ ہم سب بھائیوں کو شکار کا بھی بہت شوق تھا اس لیے فاختائیں اور تیتر وغیرہ ہم خوب شکار کرتے تھے۔ اس کے علاوہ گھر میں پائی جانے والی چھپکلیاں بھی اس چھرے والی بندوق سے نشانہ بنتی تھیں۔ اس بندوق کو اویس بھائی، میں اور عبدالرزاق بھائی زیادہ تر استعمال کرتے تھے اور استعمال کے بعد کسی بھی کونے میں یا دیوار کے پاس لگا کر

رکھ دیتے تھے۔ ایک دفعہ کیا ہوا کہ ہمارے گھر میں ایک بچی جس کی عمر زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ یا دو سال ہو گی وہ آئی اور تھوڑی دیر کے بعد بے چین ہو گئی اور رونا شروع کر دیا۔ اب بچی ایک طرح سے چِھڑی ہوئی تھی اس لیے اس کو خاموش کرانے کا ہر حربہ ناکام ہو رہا تھا۔ کبھی اس بچی کی ماں اس کو اٹھائے کبھی ہم اٹھائیں اور کبھی اس کو کوئی کھلونے دے کر بہلانے کی کوشش کریں لیکن بچی خاموش ہونے یا بہلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ یہ واقعہ بھی گرمیوں کا ہے اور مغرب اور عشاء کے درمیان کا۔ پہلے پہل تو بچی کو بہلانے کی کوششیں ہوتی رہیں اور ساری کوششیں بے کار ہونے لگیں تو ایک عجیب قسم کا ذہنی تناؤ چھانے لگا۔ اس ذہنی تناؤ کا اثر تھا کہ میں نے بچی کو خاموش کرانے کے لیے عجیب و غریب قسم کی آوازیں جو بظاہر ڈرانے کے لیے تھیں، نکالنی شروع کر دیں لیکن کیا آفت کی پرکالہ بچی تھی کہ کوئی حربہ کارگر نہیں ہونے دیتی تھی۔ دفعتاً میری نظر چھرے والی بندوق پر پڑی اور ایک اچھوتا خیال ذہن میں کوندا۔ خیال یہ تھا کہ اگر اس چھرے والی گن کو خالی لوڈ کر کے صرف پریشر کے ساتھ چلایا جائے تو اس کی آواز سے بچی سہم جائے گی اور ممکن ہے کہ خاموش ہو جائے۔ چنانچہ میں نے اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے چھرے والی گن اٹھائی اور لوڈ کر کے اس بچی کی کنپٹی پر نالی رکھ دی۔ بچی کو اس کی ماں نے اٹھایا ہوا تھا اب سین کچھ یوں تھا کہ ہمارے گھر کے مغربی دروازے پر سیمنٹ والی جالیاں تھیں اور ان سیمنٹ والی جالیوں پر کچھ ناقابل استعمال پیالیاں رکھی ہوئی تھیں غالباً چڑیوں کے لیے پانی اور

باجرہ ان میں رکھا جاتا تھا۔ بچی کا چہرہ جنوب کی طرف تھا اور جیسے ہی میں نے گن کا ٹرائیگر دبانا چاہا تو دفعتاً خیال آیا کہ مقصد تو بچی کو ڈرانا ہے کیوں نہ گن کی نالی ذرا اوپر کر لی جائے تو یہاں پر پھر والدین کی دعائیں بجلی کی سرعت سے زیادہ تیزی سے آسمان سے نازل ہوئیں۔ ٹرائیگر دبا اور سامنے والی ایک پیالی کرچی کرچی ہو گئی۔ میرا رنگ فق ہو گیا چوں کہ گن لوڈڈ تھی اور اس میں چھرا موجود تھا جس کا مجھے پتا نہ تھا اور جیسے ہی میں نے گن کو لوڈ کیا وہ اس قابل ہو گیا کہ جیسے ہی ٹرائیگر دبے اور وہ گن کی نالی سے نکلنے والے عمل میں سے گزرے اور نقصان کرے۔ تو جناب اب آپ اندازہ لگائیں کہ کیسے اس بچی کی جان بچی اور اپنی ناگہانی موت سے خون میں لت پت ہو کر شہید ہونے سے کیسے بال بال بچی۔ وہ تو چپ ہوئی یا نہیں لیکن میرے رونگٹے ایسے کھڑے ہوئے کہ ناقابلِ بیان ہے، اور میں نے چشمِ زدن میں اپنے آپ کو انتہائی لاغر اور بے بس محسوس کرتے ہوئے اپنے والدین کی عزت اور اپنے مستقبل کو تباہ و برباد ہوتے ہوئے دیکھا۔ معاملہ ویسے زیادہ تر کسی کی بھی سمجھ میں نہ آیا۔ مدتوں بعد بھائی اویس نے مجھے یاد کروایا کہ ایک دن تم قاتل بنتے بنتے رہ گئے تھے۔ آج بھی جب یہ واقعہ یاد آتا ہے تو باوجود اتنی پختہ عمر ہونے کے میری ہتھیلیوں کا پسینہ خشک نہیں ہوتا اور صرف اللہ تعالیٰ کا فضل جو میرے والدین کی دعاؤں کے پیچھا کرنے سے ہوا، ذہن میں رہ جاتا ہے اور میں سوچتا ہوں کہ اگر ماں باپ کی دعائیں نہ ہوں تو بندہ کیسے کیسے خوفناک مراحل میں داخل ہو جاتا ہے۔

اغوا کاروں کے ہتھے چڑھنے اور بال بال بچنے کا ایک اور واقعہ اس وقت پیش آیا جب ایک دن میں سکول جانے کی بجائے کتابوں کے بستے سمیت بادشاہی مسجد چلا گیا۔ میرا مقصد وہاں رکھے نوادرات کو دیکھنا تھا جن کا تعلق نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور دوسرے بزرگانِ دین سے بتایا جاتا ہے۔ میں اس وقت ساتویں یا آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا اور گورنمنٹ ہائی سکول وحدت کالونی میں زیرِ تعلیم تھا۔ کچھ طبیعت میں سیلانی پن تھا اور کچھ اس زمانے کے مروجہ تفریحی ذرائع یعنی تاریخی کتب ورسائل کے ساتھ لگاؤ جس میں تاریخی شخصیات اور ان کے زیرِ استعمال روزمرہ کی اشیاء جیسے کہ ان کا لباس، زیور اور خاص طور پر اس زمانے میں لڑائی اور جنگوں میں استعمال ہونے والے ہتھیار خاص طور پر تیر کمان، تلواریں، خنجر اور ڈھالیں وغیرہ۔ ان اشیاء کا استعمال، تاریخی قصے کہانیوں میں بہت زیادہ بیان ہوا ہے۔ ذہن میں ان نوادرات کا تصور کچھ اس قدر جاذبِ نظر بن گیا اور جب یہ علم ہوا کہ یہ تمام اشیاء بادشاہی مسجد اور اس کے ساتھ موجود شاہی قلعے میں موجود ہیں تو رہا نہ گیا۔ اس لیے اکیلا ہی کسی کو بتائے بغیر اور کسی کو ہمراہ لیے بغیر وہاں پہنچ گیا۔ بادشاہی مسجد کے مرکزی دروازے کے دائیں ہاتھ ساتھ ہی بغیر کسی ٹکٹ کے تنگ تنگ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیلری میں رکھی ہوئی نوادرات کو دیکھنے کے بعد ذہن نے ارادہ بنایا کہ پرانے زمانے میں جنگوں میں استعمال ہونے والے اسلحے یعنی نیزے، تلواریں اور تیر کمان کی بھی زیارت کی

جائے تو بجائے گھر واپس آنے کے شاہی قلعے میں مرکزی دروازے کے ساتھ ٹکٹ گھر سے ایک سٹوڈنٹ ٹکٹ لیا اور خراماں خراماں شاہی قلعے کا نظارہ کرنا شروع کر دیا۔

شاہی قلعے کے باغات، شیش محل، دیوانِ خاص اور دیوانِ عام دیکھنے کے بعد جب میں نوادرات کے لیے مخصوص عمارت جس میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کا حنوط شدہ گھوڑا اور سکھوں کی پینٹنگ وغیرہ لگی تھی، داخل ہوا تو ایک تجربہ کار اغواکار شخص کی آنکھوں کا شکار ہو گیا۔ وہ شخص میرے پاس آیا اور آتے ہی بولا، اوئے سکولوں دوڑ کے آیاں؟ (اوئے سکول سے بھاگ کر آئے ہو؟) میں سٹپٹا گیا کیوں کہ حقیقت تو یہی تھی لیکن پُر اعتماد دِکھنے کے لیے اور اس کے چنگل سے بچنے کے لیے کہہ دیا، بھاگ کر تو نہیں چھٹی لے کر آیا ہوں اور معاشرتی علوم میں پڑھے ہوئے اسباق کا عملی نمونہ دیکھنے آیا ہوں۔ یہ کہہ کر میں جلدی سے اس عمارت کے اندر داخل ہوا اور کتابوں کے بستے میں سے کاپی اور قلم نکال کر اس عجائب گھر میں پڑی ہوئی نوادرات کے بارے میں لکھنے لگ گیا۔ یہ چال بھی اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے ذہن میں ڈالی اور برکتیں وہی تھیں جو ماں باپ کی دعاؤں کے طفیل آسمان سے آئیں اور میرے دفاع میں میرے ساتھ شامل ہو گئیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد جب میں نے محسوس کیا کہ وہ مشکوک شخص اب موجود نہیں ہے اور بظاہر غائب ہو گیا ہے تو فوراً پینترا بدلا۔ جلدی جلدی عجائب خانے کا چکر لگایا اور وہاں سے نکل آیا۔ بعد ازاں بھیڑ میں سے ہوتے ہوئے بس سٹاپ

پہنچا، وہاں سے غالباً 27 یا 28 نمبر بس میں بیٹھا اور سکول سے چھٹی کے وقت گھر پہنچ گیا۔

اسی طرح سکول میں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں اور دوپہر کے وقت اپنے گھر کے ساتھ بہنے والی المعروف 'اچھرہ نہر' میں نہانے کا پروگرام کبھی چھوٹے بھائی کے ہمراہ یا کبھی محلے کے دوستوں کے ہمراہ بناتا تھا اور گرم دوپہریں ٹھنڈی کی جاتی تھیں۔ ایک دن قسمت کی یاوری کچھ اس طرح ہوئی کہ نہ تو کوئی بھائی اور نہ ہی کوئی محلے کا دوست ہمراہ تھا۔ خود اکیلا ہی گھر سے نکلا اور اولڈ مسلم ٹاؤن سے ہوتا ہوا مرحوم سنتوش کمار (فلم ایکٹر) کے گھر سے گزرتا ہوا اچھرہ نہر پہنچ گیا۔ یہاں پر اور بھی کافی لڑکے بالے نہا رہے تھے اس لیے اللہ کا نام لے کر میں نے بھی نہانے کی تیاری کی اور نہر میں نہانا شروع کر دیا۔ اسی دوران نہر کے کنارے مٹر گشت کرتا ہوا ہرکاروں کا ایک ایجنٹ جو میری حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا کنارے پر آیا اور بڑی بارعب آواز میں بولا، اوئے باہر آ۔ میں نے نہاتے ہوئے اپنے دائیں بائیں دیکھا کہ شاید یہ کسی اور کو باہر آنے کا کہہ رہا ہے لیکن جب اس نے دوسری دفعہ غراہٹ زدہ آواز میں مجھے کہا کہ تم باہر آؤ تو ذہن میں فوراً خیال آیا کہ نہر میں نہاتے ہوئے اکثر بچے اغوا کاروں کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں، میں بھی یقیناً اس بندے کے قابو آنے والا ہوں۔ یہیں سے ایک بار پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کی مدد اور رحمت نازل ہوئی اور میں نے فوراً اونچی اونچی آواز میں 'چاچا، چاچا' کی آوازیں لگانا شروع کر دیں۔ بظاہر میں یہ آوازیں اس شخص کو باور

کروانے کے لیے لگا رہا تھا کہ میں اکیلا نہیں ہوں بلکہ میرا چچا بھی ساتھ ہے لیکن اندر سے میرا ڈر کے مارے حال برا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہی اس ناگہانی صورتِ احوال سے نکالے۔ یہاں پر کرشمہ کیا ہوا کہ میرے کچھ دوست جو مسلم ٹاؤن کرکٹ کلب میں کھیلتے تھے، وہ نمودار ہوئے۔ میں نے ان کو دیکھا، مجھے حوصلہ ہوا اور اب کی بار میں نے چاچا، چاچا کی بجائے اپنے ان دوستوں کو پکارا۔ وہ مجھے پہچان گئے اور جلد ہی میں نہر سے باہر نکل کر ان کے درمیان پہنچ گیا۔ اسی اثنا میں وہ مشکوک شخص وہاں سے کھسک گیا اور میں نے موقع محل کے اعتبار سے وہاں سے نکل کر اپنے گھر کی راہ لی۔

اسی طرح کا ایک واقعہ جس کی بدولت قانون نافذ کرنے والے ادارے کے اندر چھپی ہوئی کالی بھیڑیں اور ان کا نیٹ ورک ظاہر ہوا میرے ساتھ پیش آیا۔ یہ 1975ء کا واقعہ ہے اور میں نے میٹرک کا امتحان دیا ہوا تھا۔ ایک دن میں نے اور میرے کلاس فیلو حفیظ خان نے پروگرام بنایا کہ قذافی سٹیڈیم سے ملحقہ سپورٹس کمپلیکس میں جایا جائے اور وہاں پر انڈور کھیلوں سے متعلقہ کھیلوں کے سامان کو دیکھا جائے اور اگر ہو سکے تو تھوڑی سی سپورٹس بھی کی جائے۔

چنانچہ مقررہ دن کو میں اپنے گھر E بلاک رحمانپورہ کالونی سے صبح دس بجے نکلا اور پیدل ہی چل پڑا۔ مسلم ٹاؤن موڑ سے ہو کر فیروز پورہ روڈ نہر کا پل کراس کیا اور PCSIR لیبارٹریز سے نکلتا ہوا قذافی سٹیڈیم سے چند سو میٹر کے فاصلے پر تھا تو ایک ہٹا کٹا پولیس مین سادہ کپڑوں میں سائیکل پر سوار عقب سے نمودار ہوا

اور میرے نزدیک آکر آفر کی کہ اگر قذافی سٹیڈیم جارہے ہو تو میری سائیکل کے پیچھے بیٹھ جاؤ میں بھی وہیں جارہا ہوں۔ میں نے کہا، نہیں میں قذافی سٹیڈیم تو نہیں لیکن اس سے ملحقہ سپورٹس جمنیزیم میں جارہا ہوں۔ کہنے لگا، کوئی بات نہیں مجھے قذافی سٹیڈیم میں تھوڑا کام ہے وہاں چند منٹ رکوں گا اور پھر تمھیں سپورٹس جمنیزیم اتار دوں گا۔ میں سائیکل پر بیٹھ گیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ شخص قذافی سٹیڈیم میں قائم پولیس ہیڈ کوارٹر میں چلا گیا۔ وہاں پر میں نے دیکھا کہ اچھا خاصا پولیس کا سیٹ اپ ہے اور جہاں دفاتر ہیں وہیں پر ہوسٹل بھی تھے۔ یہ بات پہلے میرے علم میں نہیں تھی کہ قذافی سٹیڈیم کے خالی کمروں میں اس طرح کے صوبائی گورنمنٹ کے دفاتر اور ہوسٹلز بھی قائم تھے۔ بہرحال یہاں پر ماتھا اس وقت ٹھنکا جب اس شخص نے انتہائی پُراسرار طریقوں سے اور اشاروں کنایوں کے ساتھ اپنے کسی دوسرے ساتھی کے ساتھ گفتگو کی اور ایک آدھ بار میری طرف بھی دیکھا۔ یہاں پر ایک بار پھر والدین کی دعاؤں کا اثر اور آمد آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں چوکنا ہوگیا اور ساتھ ہی اس شخص کو مخاطب کیا کہ بھائی میں تو جارہا ہوں کیوں کہ میرا دوست وہاں پہنچ گیا ہوگا اور انتظار میں ہوگا۔ وہ بولا، ٹھہرو میں بھی چلتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ اس لمبے چوڑے ہوسٹل جس میں تیس کے قریب چارپائیاں بچھی تھیں باہر آگیا اور ہم ایک بار پھر سائیکل پر سوار ہوکر سٹیڈیم سے باہر سپورٹس کمپلیکس کی طرف روانہ ہوگئے۔ ماں باپ کی مانگی ہوئی دعائیں آسمان سے میرے لیے خیریت کا پیغام لے کر زمین پر اتر چکی تھیں اور

رحمت کے فرشتے میری مدد کو مکمل تیار تھے۔ جیسے ہی ہم قذافی سٹیڈیم کے بڑے مرکزی دروازے سے نکل کر فیروزپور دوڑ داخل ہوئے وہیں پر میرا دوست اور کلاس فیلو حفیظ خان اپنی سائیکل پر نظر آیا۔ میں نے جھٹ سائیکل سے چھلانگ لگائی اور حفیظ خان حفیظ خان کہتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ اسی اثنا میں وہ مشکوک پولیس والا کھسیانا سا ہو کر جلدی سے نکل گیا اور میں حفیظ خان کی سائیکل پر بیٹھ گیا۔ بعد میں حفیظ خان گویا ہوا کہ تم اس شخص کے ہتھے کیسے چڑھ گئے یہ تو پولیس والے انتہائی مشکوک قسم کی حرکات و سکنات میں ملوث ہوتے ہیں اور کسی بھی بچے کو اغواکاروں کے ہاتھوں بیچ دیتے ہیں۔ حفیظ خان باتیں کرتا جارہا تھا اور میں کہیں دور اپنے والدین کی دعاؤں کی ٹھنڈک اور حفاظتی حصار میں اپنے آپ کو محسوس کررہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک بار پھر مجھے انجانی راہوں پر دھکے کھانے سے بچالیا تھا اور یہ سب میرے والدین کی دعاؤں اور مناجات کا اثر تھا۔

ماں باپ کی دعائیں ساری زندگی آپ کا پیچھا کرتی ہیں اور آپ کو ہر جگہ ہر وقت اپنے حفاظتی حصار میں رکھتی ہیں۔ ایک دفعہ ڈیرہ غازی خان سے میں اپنی فیملی کو لے کر لاہور کے لیے روانہ ہوا۔ میرے پاس 1989 ماڈل کی سوزوکی آلٹو کار تھی اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حفصہ اور بلال چھوٹے چھوٹے تھے جبکہ مطاہر جمال اپنی والدہ کی گود میں تھا اور زیادہ سے زیادہ اس کی عمر چھ ماہ ہو گی۔ ڈیرہ غازی خان سے پھول نگر (پرانا نام بھائی پھیرو) تک تو سفر بہترین رہا، کوئی کسی قسم کی پریشانی لاحق نہ ہوئی۔ نہ تو ٹائر پنکچر ہوا اور نہ ہی کوئی دوسری پیچیدگی

سامنے آئی لیکن چونکہ شام کا وقت ہو گیا تھا اس لیے ملتان روڈ جو پھول نگر شہر کے وسط سے گزرتی تھی اس پر ٹریفک کا بہت دباؤ تھا۔ زیادہ تر بیڈ فورڈ ٹرک جو سائز میں کافی بڑے اور دَس وھیلر کہلاتے تھے، رواں دواں تھے۔ اب ہوا یوں کہ وسط شہر میں ٹریفک کے اژدھام میں دائیں اور بائیں طرف دو بڑے بڑے ٹرک تھے جو ایک دوسرے کے متوازی چل رہے تھے اور میں نے اپنی کار ان دونوں کے درمیان سے نکال کر کھلی سڑک پر آنے کے لیے سوچ بچار شروع کر دی بلکہ ایکسیلیریٹر پر دباؤ بڑھا کر ان دونوں ٹرکوں کے درمیان تنگ سی جگہ پر لے آیا۔ آلٹو لے تو آیا لیکن ہوا یوں کہ دائیں طرف والا ٹرک جو میری سائیڈ پر تھا اس نے اندر کی طرف آنا شروع کر دیا اور بہت ہی نزدیکی کا معاملہ جب ہوا تو میں نے بائیں طرف کھسکنا شروع کر دیا لیکن اس وقت میرے اوسان نہ صرف خطا ہوئے بلکہ ہاتھوں کے طوطے بھی اڑ گئے جب میں نے دیکھا کہ بائیں طرف والا ٹرک بھی جگہ بنانے کے چکر میں اندر کی طرف آ رہا ہے۔ وہ سائیڈ جہاں میری بیوی مطاہر جمال کو گود میں لیے بیٹھی تھی اب یہ صورت احوال ایسی تھی کہ دونوں طرف سے ٹرکوں نے گاڑی کو گھیرا ہوا تھا اور مسلسل اندر کی طرف آ رہے تھے۔ صورت احوال کی سنگینی کا اندازہ ہوتے ہی میں نے ہارن زور زور سے بجانا شروع کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ لائٹیں بھی جلانا بجھانا شروع کر دیں لیکن ایک تو ٹرک بڑے تھے، ان کے دروازے اور سائیڈ والے شیشے کافی اوپر تھے دوسرا آلٹو گاڑی نیچے تھی اور پوزیشن ایسی تھی کہ دونوں ڈرائیوروں کو قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ ان کے

درمیان میں ایک چھوٹی گاڑی جس میں چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، تقریباً دونوں ٹرکوں کے درمیان پسنے ہی والی ہے اور اس کا کچومر نکلنے والا ہے۔ اب اس صورتِ احوال میں میرا اندازہ یہی تھا کہ ٹرک ڈرائیور حضرات مجھے راستہ دے دیں گے اور بعد میں گاڑی نکال لوں گا لیکن نہ تو انھوں نے ہی بریک لگائی اور نہ ہی اپنے اپنے ٹرکوں کو اندر یعنی جہاں سے میں گاڑی لے کر گزر رہا تھا آنا بند کیا۔ صاف نظر آنا شروع ہو گیا کہ ان دونوں نے درمیان والی جگہ کو خالی سمجھا ہوا ہے اور اپنا اپنا بیرونی دباؤ کم کرنے کے لیے اندر کی طرف کر رہے ہیں۔ یہ وہ وقت تھا کہ میں نے باآواز بلند اللہ اکبر کہا اور آخری کوشش کے طور پر ریس کو پورا دبایا اور ہارن پر ہارن دے کر کسی طرح درمیان میں سے ہوتا ہوا باہر نکل گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس دفعہ پھر میرے ماں باپ کی دعاؤں کے طفیل میری اور میری ساری فیملی کی جان بچائی۔ تھوڑی دیر سائیڈ پر رکنے کے بعد پانی پیا اور سانس بحال کی۔ ایک یا ڈیڑھ گھنٹے کے بعد گھر آ گیا۔ میں تو سیدھا والد صاحب کے کمرے میں ان کی ٹانگیں دبا رہا تھا اور میری بیوی باورچی خانے میں میری والدہ کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ کسی کو پتا چلنے ہی نہیں دیا کہ اللہ تعالیٰ نے والدین کی دعاؤں کے طفیل کیسے کچھ دیر پہلے ایک المناک حادثے سے ہم سب کی جان بچائی ہے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ جو اگر وقوع پذیر ہو جاتا تو یہ تحریریں شاید نہ لکھی جاتیں اور اگر لکھی جاتیں تو کسی حادثے کو رپورٹ کرنے کی خاطر۔ ہوا کچھ یوں کہ ان دنوں میں اور میری فیملی ڈیرہ غازی خان میں سکونت پذیر تھے جب لاہور

سے کچھ مہمان ہمیں ملنے ہمارے گھر ڈیرہ غازی خان تشریف لائے۔ عموماً جو بھی مہمان ہمارے گھر آتا اس کے ذہن میں ایک تو سخی سرور مزار اور دوسرا فورٹ منرو صحت افزا مقام کی سیر ہوتی۔ سخی سرور تو غالباً میری رہائشی کالونی سے 35 کلو میٹر کی دوری پر تھا، فورٹ منرو کی دوری 86 کلو میٹر تھی۔ یہ جو مہمان تھے ان کی خواہش تھی کہ ہمیں فورٹ منرو کی سیر کروائی جائے۔ جن لوگوں نے فورٹ منرو کی سیر 1999 یا اس سے پہلے کی ہے وہ جانتے ہیں کہ ڈیرہ غازی خان سے سخی سرور اور سخی سرور سے سے ٹیڑھی میڑھی خطرناک سڑک پہلے راکھی گارج اور پھر فورٹ منرو کی پہاڑیوں سے ہوتی ہوئی راکھی نالہ کے ساتھ ساتھ اوپر ہوتی ہوئی ِگردو موڑ کی خوفناک بھول بھلیوں والی تنگ سی سڑک سے اوپر تقریباً چھ ہزار فٹ سطح سمندر کی اونچائی پر واقع فورٹ منرو جو کہ ایک چوٹی کا نام ہے پہنچتی ہے۔ فورٹ منرو کو انگریزوں کی آمد سے پہلے تمن لغاری کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اب تو سٹیل کا پل بن گیا ہے اور سارا علاقہ یکدم خوفناکی سے دلکشی کی طرف ڈھل گیا ہے کہ واقعی جاپانیوں نے ِگردونواح کو انتہائی خوبصورتی کے ساتھ پل کے ذریعے دورویہ سڑک بنا کر ڈیرہ غازی خان اور فورٹ منرو کی ٹریفک کو باتمیز بنا دیا ہے ورنہ کئی کئی دن یہاں ٹریفک بدترین شکل میں موجود ہوتی اور اکثر و بیشتر حادثات رونما ہوتے رہتے۔ اب آتے ہیں اصل واقعے کی طرف۔ ان دنوں میرے پاس مزدا 323 گاڑی تھی۔ میں اور میری فیملی کے ممبران کے علاوہ مہمان خاتون اور ساتھ کل ملا کر چھ بچے تھے جو گاڑی میں سوار تھے۔ گاڑی ڈیزل

پر چلنے والی تھی لیکن تھی مضبوط اور چڑھائی کی مار کھانے والی۔ جب ہم ڈیرہ غازی خان سے روانہ ہوئے تو سارے راستے میں اللہ کے فضل و کرم سے بغیر کسی قسم کی پریشانی کے ہم گِردو موڑ تک پہنچ گئے۔ وہاں کچھ دیر سستانے کے بعد اور چائے کا ایک ایک کپ پینے کے بعد گِردو موڑ کی پیچ در پیچ سنگل وے روڈ پر گاڑی ڈال دی۔ اب یہاں صورتِ احوال یہ تھی کہ جیسے ہی مخالف سمت سے آنے والی کوئی گاڑی آتی تو میں ہلکی سی بریک کے ساتھ انتہائی بائیں طرف ہو جاتا اور وہ مخالف سمت سے آنے والی گاڑی چونکہ اونچائی سے آ رہی ہوتی اس لیے وہ بھی انتہائی احتیاط کے ساتھ اپنا راستہ اپناتی۔ کرتے کرتے سنگل روڈ جس کے ایک طرف پہاڑ اور دوسری طرف کھائی تھی، جلیبی کی طرح بنے راستے سے گزرتی رہی یہاں تک کہ اس سنگل روڈ والے پہاڑ کے مغربی سمت والا پہاڑ جس کی سڑک دونوں طرف سے محفوظ نظر آتی تھی یعنی کسی طرف بھی نشیب یا کھائی نہیں تھی، وہ شروع ہو گئی لیکن چڑھائی بہر حال تھی۔ اب معاملہ یہ ہوا کہ جیسے ہی ہماری گاڑی سیدھی ہوئی اور گرودموڑ کے نشیب والی روڈ یا سمجھ لیں بائیں طرف جو گہرا خلا ہے اس کو چھوڑ رہی تھی کہ ہمارے آگے آگے ایک لوڈڈ ٹرک بھی چڑھائی چڑھ رہا تھا۔ ٹرک میں لدے وزن اور چڑھائی پر لگے زور کی وجہ سے اس کے سلنسر سے نکلتا ہوا دھواں ایک تو کثیف اور دوسرا گہرے کالے رنگ کا تھا۔ میں بھی درمیانی فاصلہ رکھ کر اس ٹرک کے پیچھے پیچھے اپنی گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ ابھی چڑھائی درمیان میں ہی تھی کہ آگے جانے والا ٹرک رُک گیا۔ شاید اس کا موشن ٹوٹ گیا

یا کوئی اور وجہ ہوئی میں نے بھی گاڑی کو بریک لگائی۔ گرمی کافی تھی گاڑی میں سواریاں اور بچے میں نے آپ کو گنوا دیے تھے اب آپ اندازہ لگائیں اگر اسی صورت میں گاڑی جو بغیر A-C کے تھی پانچ منٹ بھی رکی رہتی تو ان سواریوں کا کیا ہوتا جو اندر بیٹھی ہوئی تھیں اور بچے جو مسلسل شور کر رہے تھے ابھی ذہن میں یہ صورتِ حال چل رہی تھی کہ اچانک ٹرک پیچھے کی طرف آنا شروع ہو گیا۔ ٹرک چونکہ آگے تھا اور چڑھائی سے اترائی کی طرف آ رہا تھا، فلی لوڈڈ بھی تھا نیز سائز میں بھی بڑا تھا اگر خدانخواستہ میری گاڑی کو ٹکراتا تو چشم زدن میں بچوں سے بھری گاڑی لڑھکنیاں کھاتی گردو موڑ کے نیچے ہوا میں تیرتی ہوئی گر رہی ہوتی اور جب زوردار دھماکے سے گرتی تو آگے سوچنے کی گنجائش کم از کم میرے ذہن کا کام نہیں تھا۔ لیکن یہاں پر پھر خدائی مدد سمجھ لیں جو والدین کی دعاؤں کے طفیل میرے خاندان اور مہمان خاندان پر اتریں اور یہ ساری ڈرامائی صورتِ احوال کچھ اس طرح امن و آشتی کی طرف لوٹ گئی جیسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرشتے بھیج دیے ہوں اور انھوں نے ہمیں اس گھمبیر و ہولناک صورتِ احوال سے ایسے نکالا جیسے مکھن سے بال۔

جیسے ہی ٹرک نیچے کی طرف حرکت کرنے لگا مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ بس اب کے اب ہماری گاڑی کے فرنٹ کو اس کی بیک ٹکرائے گی، میری بیوی اور مہمان خاتون کی چیخیں بلند ہوئیں۔ میں نے اللہ اکبر واشگاف آواز میں بلند کیا اور ہارن پر ہاتھ رکھ لیا یہ عمل جتنی دیر رہا اس ٹرک کو رک جانا چاہیے تھا لیکن ہمارے

شور و غوغا کرنے کے باوجود جب ٹرک نہ رکا تو ہماری سانسیں تقریباً بند ہو گئیں اور پھر یکایک کیا ہے کہ ٹرک اچانک رک گیا۔ شاید ٹرک کے پچھلے ٹائر کے نیچے کوئی پتھر آ گیا اور اس نے ٹرک کو روک لیا۔ میرے لیے یہ موقع کافی تھا، اللہ نے نصرت عطا کی اور جلدی سے گاڑی کو ریورس میں کیا اور دائیں طرف کاٹا اور پہلے گیئر میں فل سپیڈ سے گاڑی ٹرک کے نرغے سے نکال لی۔ پھر گاڑی کو پہلے ہی گیئر میں اوپر تک لیے گیا جب تک کھلی جگہ نہ آ گئی۔ وہاں تھوڑی دیر رکے، اللہ کا شکر ادا کیا اور مہمان خاتون اور بچوں کے اوسان جو خطا ہو گئے تھے معمول پر آئے اور ہم منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

باب دوم

# بچپن کی اٹھکھیلیاں

## دشمن کا جسوس (جاسوس)

یہ واقعہ ان دنوں کا ہے جب سیل فون، لیپ ٹاپ اور کمپیوٹر ابھی نوزائیدہ دور میں تھے اور خاص کو چھوڑ کر عام آدمی کے حصول میں نہیں تھے۔ لاہور شہر اور اس کے مضافات میں ذرائع تفریح زیادہ تر سینماؤں میں فلم بینی، کتابوں کی دکانوں میں مختلف قسم کے نئے نئے ناولوں خاص طور پر رومانی، جاسوسی اور فکشن کے موضوعات پر مبنی کتابوں کی فروخت اور کھیلوں کے میدانوں میں فٹ بال، ہاکی، کرکٹ، گلی ڈنڈا وغیرہ پر مشتمل ہوتے تھے۔ ان تمام ذرائع کے علاوہ سٹیج ڈرامہ بھی اپنے نقطۂ عروج پر تھا جہاں دن بھر کی مشقت سے تھکے ہارے جسم و دماغ چند گھنٹوں کی بے ربط کہانیوں لیکن جاندار مزاحیہ اداکاری اور جملوں سے فیض یاب ہوتے۔ بعد میں یہیں سے سنی اور سیکھی ہوئی مزاحیہ باتیں، جملے اور حرکات روزمرہ زندگی میں اپنے جاننے والوں دوستوں یا بے تکلف تعلق داروں

کے ساتھ کرتے۔ وسطی پنجاب جس میں لاہور، گجرانوالہ، سیالکوٹ اور فیصل آباد خصوصی طور پر مزاح اور مزاح پر دازوں کے لیے مشہور ہیں وہاں پر عام لوگ باوجود سماجی، ذہنی اور جسمانی پریشانیوں کے مزاح کی طرف بھرپور رُخ رکھتے ہیں اور کسی بھی حالت میں ایسے بات کہنے سے نہیں رُکتے جس میں ہنسی مسکراہٹ والا عنصر نہ ہو۔

اسی طرح کا ایک واقعہ جس کو سنانے کے لیے مندرجہ بالا تمہید و بحث اختیار کرنا پڑی وہ یہ ہے کہ ہمارے محلے رحمان پورہ میں ایک صاحب رہتے تھے، نام ان کا کوئی بھلا سا تھا لیکن وہ عام طور پر سیٹھی کے نام سے پکارے اور پہچانے جاتے تھے۔ سیٹھی صاحب کی تعلیم بس واجبی سی تھی اس لیے کوئی ڈھنگ کا یا یہ کہہ لیجیے کوئی بارعب سرکاری عہدہ نہیں رکھتے تھے۔ ان کا قد کاٹھ اور بہترین تراش خراش والا لباس، بہترین پالش کیے شوز اور رین بو کی کوئی تیسری نقل والی عینک پہنے ہوئے خراماں خراماں بڑے وقار کے ساتھ گلی محلے اور بازار میں چلتے۔ بظاہر ایسے لگتا کہ کوئی اعلیٰ سرکاری عہدہ دار جو خاص مِشنری ڈیوٹی پر خاص قومی مفادات کے تحفظ کے لیے اپنے مشن پر ہے۔ آتے جاتے لوگ سلام کرتے تو جواب ضرور دیتے لیکن ایسے لگتا جیسے سلام کا جواب دیتے ہوئے ان کا انتہائی قیمتی وقت صرف ہوا ہے، جس کو وہ بروئے کار لا کر کسی نہ کسی ملک دشمن سرگرمی کا قلع قمع کر سکتے تھے۔ ان کی چال ڈھال اور گفتگو اتنی پُراسرار ہوتی تھی کہ محلے دار ان کی نوکری کی وجۂ تسمیہ سمجھنے اور ان سے پوچھنے سے قاصر تھے۔ ویسے بھی بھلا

مانس زمانہ تھا۔ لوگ ایک دوسرے کے معاملات میں زیادہ تانک جھانک کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ پبلک ٹرانسپورٹ زیادہ تر سرکاری تھی جس میں ذرائع آمد و رفت زیادہ سستی اور آسانی سے دستیاب ہو جاتی تھی۔ وہ عام لوگوں خاص طور پر طالب علم، محنت کشوں اور اوسط درجہ گھرانوں کے لیے بہترین نعمت سمجھی جاتی تھی، عام طور پر اندرون شہر سفر کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ ہمارے پرانے محلے کے ساتھ ہی وحدت روڈ جو اندازاً چھ یا سات کلو میٹر طویل ہے، اس کا ایک سِرا فیروز پور روڈ سے ملتا ہے مسلم ٹاؤن سے ہوتی ہوئی وحدت کالونی کوارٹرز، علامہ اقبال ٹاؤن اور فیصل ٹاؤن سے ہوتی ہوئی ملتان روڈ کو مل جاتی ہے۔ اس روڈ پر اس زمانے میں 27 اور 28 نمبر کی ڈبل ڈیکر بسیں بھی چلتی تھیں اور ہر وقت مسافروں سے لدی پھندی رہتی تھیں۔ اس طرح کی ایک بس میں ایک دفعہ سیٹھی صاحب اپنی بارعب شخصیت کے ساتھ آنکھوں پر چشمہ جمائے بال اشوک کمار کی طرح بنائے بڑے سنجیدہ ہو کر سفر کر رہے تھے۔ چونکہ بس میں رش زیادہ تھا اس لیے کھڑے ہو کر بس کے نیچے والے حصہ میں ڈنڈے کو ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے تھے۔ جب کنڈکٹر آیا اور ٹکٹ کا پوچھا تو سیٹھی صاحب نے کوئی جواب نہ دیا۔ اب کنڈکٹر ٹکٹ کے بارے میں پوچھ رہا تھا جب کہ سیٹھی صاحب جو ٹکٹ خرید کر سفر کرنے کے عادی نہ تھے، اس کی بات کو سنی ان سنی کر کے اِدھر اُدھر آگے پیچھے دائیں بائیں بڑی تلاش بسیار نظروں سے دیکھے جا رہے تھے۔ کنڈکٹر بار بار تقاضا کر رہا تھا کہ ٹکٹ دکھائیں یا نیا بنوائیں کہ اسی دوران کچھ سیٹوں پر بیٹھے دوسرے مسافر

بھی متوجہ ہو گئے۔ معاملے کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے سیٹھی صاحب نے دائیں ہاتھ والی انگلی منہ پر رکھ کر 'شی' کی آواز نکالی اور کنڈکٹر کو کہنے لگے 'خاموش۔ چپ رہو میں ایک سرکاری ادارے کا افسر ہوں خاص مشن پر ہوں۔ اس بس میں ایک دشمن ملک کا جسوس (جاسوس) گھس گیا ہے، اس کا پیچھا کر رہا ہوں۔ لہٰذا خاموش رہو ورنہ وہ بھاگ جائے گا اور ہوشیار ہو جائے گا۔ سمجھ گئے یہ بات؟' سیٹھی صاحب نے زبان دبا کر یہ بات انتہائی سرگوشی میں کی جو وہاں پر موجود ایک دوست نے کمال ایکٹنگ کرتے ہوئے بتائی اور یہ بھی علم ہو گیا کہ سیٹھی صاحب کیا چیز تھے اور ان کا کس قسم کے پر اسرار کام سے تعلق ہے۔ بعد میں جب یہ بات محلے کے لڑکوں کے علم میں آئی تو وہ سب سمجھ گئے اور وہ بات کا بتنگڑ بن گئی۔ جب بھی کوئی لڑکا کسی دوسرے لڑکے سے کسی قسم کا تقاضا کرتا تو وہ بالکل سیٹھی صاحب کے انداز میں ہونٹوں پر انگلی رکھتا اور شی کی آواز نکالتا اور سیٹھی صاحب کے لہجے میں کہتا۔ 'ارے چپ ہو جاؤ، ایک جسوس (جاسوس) کے پیچھے ہوں زیادہ باتیں نہ کرو۔' یہ بات اتنی مشہور ہو گئی کہ کافی عرصے تک ضرب المثل کے طور پر کہی اور سنی جاتی رہی۔

## دُدھ (دودھ)

ہمارے محلے میں کئی کردار ایسے تھے جن کے بغیر بچپن کی شوخیاں، کت کتاریاں بالکل ادھوری ہوتی تھیں۔ مثلاً ہماری گلی میں ایک مقامی پرائمری سکول کے ہیڈ ماسٹر جناب محمد یوسف صاحب بھی رہا کرتے تھے۔ ان کے تین صاحب

زادے تھے۔ اس زمانے کے حساب سے میٹرک تعلیم یافتہ' سب سے بڑے اور سب سے چھوٹے صاحب زادے تو کافی سمجھدار اور معاملات کی نزاکت کو سمجھ کر گفتگو کرنے والے لیکن منجھلے یعنی درمیان والے صاحب زادے محمد خلیل عرف کھِیلا کافی کھلی ڈھلی اور بے نیاز طبیعت کے مالک تھے۔ خلیل عرف کھِیلا کی یاری دوستی کچھ نشئی لوگوں کے ساتھ بھی تھی اور جو بعد میں بڑھتے بڑھتے پکی ہوتی گئی اور ان لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے عام بول چال کے لیے استعمال ہونے والی زبان بھی خلط ملط ہو گئی۔ اس پر کمال یہ کہ پنجابی فلمیں جو نزدیکی سینما "ارم" ملحقہ مسلم ٹاؤن میں دیکھی اور دکھائی جاتی تھیں، ان کے بھی خلیل عرف کھِیلا کے مزاج و زبان پر بہت بڑا اثر پڑا۔ ماسٹر یوسف بلا شبہ انتہائی شریف النفس اور سماجی رابطوں پر خصوصی نظر رکھتے تھے لیکن باوجود انتہائی احتیاط کے کھِیلا ان کے قابو سے باہر ہو گیا۔ اب تو یہ حال ہو گیا کہ خلیل عرف کھِیلا بھی متواتر نشہ کرنے لگ گئے اور دو ایک بار نشے کی حالت میں سائیکل چلاتے ہوئے حادثات سے دوچار ہو کر اپنی ٹانگ بھی تڑوا بیٹھے۔ بہر حال ایک دفعہ یوں ہوا کہ خلیل عرف کھِیلا نے ایک سستے سے نشہ کی وجہ سے کافی پریشانی کا سامنا کیا بلکہ اپنے دوستوں اور محلے داروں کو بھی اس کا نشانہ بنایا۔ نشے کی حالت میں دماغ تو ماؤف ہوا ہی لیکن ساتھ زبان بھی لڑکھڑا گئی اور اول فول بکنے لگی۔ اب چونکہ نشہ سستا والا تھا اس لیے اس کا بر ارد عمل جلد ہی سامنے آ گیا اور منہ و حلق خشک ہو گئے۔ اس حالت میں کھِیلا بار بار کہے جائے کہ مجھے دُدھ (دودھ) پلاؤ اب ظاہر ہے۔ دودھ کا مطالبہ وہ اس لیے کر

رہا تھا کہ منہ اور حلق میں خشکی تھی تو اس کے خیال کے مطابق دودھ پینے سے یہ خشکی ختم ہو جاتی، اس لیے دودھ کا لفظ اس کی لڑکھڑاتی نشئی زبان سے دُدھ کی شکل میں نکلے۔ پھر ہوا یوں کہ اس کے دماغ میں یہی لفظ دُدھ چپک گیا اور جیسے گراموفون کے ریکارڈ میں کوئی نقص آ جائے تو سوئی وہیں اٹک جاتی ہے اور بار بار ریکارڈ کا مخصوص حصہ ہی بجتا رہتا ہے، اسی طرح "کھِیلا" بھی بار بار دُدھ، دُدھ کہتا جائے اور اسی لفظ کی تکرار کے دوران اسے مدہوشی سی ہو جائے اور کچھ دیر کے لیے اُس کی طرف سے خاموشی بھی۔ اس کے دوسرے نشئی دوست کسی حد تک حالتِ ہوش میں تھے اور انھوں نے "کھِیلا" کو مذاق کا تختۂ مشق بنالیا تھا۔ جیسے ہی "کھیلا" خاموش ہوتا تو ان شرارتی دوستوں میں سے کوئی ایک کہتا، 'اوے کھِیلے! کی دِل کر دا ای؟ (اوئے خلیل! کیا دل کرتا ہے؟) تو کھِیلا فوراً جاگ کے کہتا، 'دُدھ۔' اسی طرح یہ کھیل کافی دیر تک چلتا رہتا۔ جب بھی خلیل (کھِیلا) حالتِ مدہوشی میں جاتا کوئی ایک دوست نعرہ لگاتا (او کھِیلے کی دل کر دا ای) تو کھِیلا ہڑبڑا کر فوراً بولتا، 'دُدھ، دُدھ۔' یہ کھیل ابھی جاری تھا کہ کسی نے خلیل کے بڑے بھائی جمیل کو بتادیا کہ لوگوں نے "کھِیلے" کا مذاق بنایا ہوا ہے۔ وہ آیا، غصہ میں دو چار صلواتیں سنائیں۔ ایک ادھ تھپڑ خلیل کو لگایا اور اٹھا کر گھر لے گیا۔ بعد میں یہ فقرہ بھی لڑکوں بالوں کے ہاتھ میں خوب گھوما کہ (کی دل کر دا ای) دوسرا جواب دیتا، دُدھ۔

## ایٹم بم

ہمارے ایک اور جاننے والے پرویز عرف 'پیجی' تھے۔ نشہ کی لَت نے

پیجی کے اندر کا ٹیلنٹ تباہ کر دیا تھا۔ پیجی کو نامور پنجابی تصوف کے شاعروں کا کلام ازبر تھا۔ خاص طور پر نشے کی حالت میں تو اس کے منہ سے شاعری چھن چھن برستی۔ 'پیجی' میری اور میرے بھائیوں کی بہت عزت کرتا تھا۔ چونکہ خود بھی کرکٹ کا شوقین تھا۔ کھیلتا بھی اچھا تھا اور باوجود نشئی ہونے کے حیرت انگیز طور پر نئے اور پرانے بال دونوں سے سوئنگ باؤلنگ کر لیتا تھا۔ اس لیے میرے ساتھ محلے داری کے علاوہ کرکٹ کا بھی تعلق رکھتا تھا۔ گرمیوں میں یا موسمِ خزاں میں جب کبھی یونیورسٹی سے چھٹیاں ہوتیں تو وہ اکثر ملاقات کرتا۔ ہماری ملاقاتیں عام طور پر ہمارے محلے کے کرکٹ گراؤنڈ میں ہوتیں اور کئی معاملات زیرِ بحث آتے۔ مجھے یاد ہے جب 4 اپریل 1979 کو ذوالفقار علی بھٹو صاحب کو پھانسی کی سزا ہوئی تو 'پیجی' نے میرے ساتھ عدالتی کارروائی سے لے کے کال کوٹھڑی، بلیک وارنٹ، پھانسی گھاٹ غرض یہ کہ وہ تمام مراحل جو اس پراسیس میں ہوتے ہیں ان کے بارے میں سیر حاصل گفتگو کی۔ علاوہ ازیں کرکٹ کے موضوع پر خوب بحث و مباحثہ ہوتا۔ اتنی کھلی ڈھلی ملاقاتوں میں کیا مجال ہے اگر 'پیجی' نے مجھے کبھی سگریٹ یا نشہ کی طرف دعوت دی ہو۔ کبھی نہیں، یہ شاید اس کے اندر کا شریف النفس آدمی تھا یا کوئی اور وجہ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا خصوصی کرم تھا، اس لیے اس کی زبان اور ذہن کو ان مکروہات سے روکے رکھا۔

یہ غالباً اپریل کا آغاز تھا اور موسمِ بہار کی روانگی تقریباً ہو چکی تھی۔ دھوپ میں سختی اور گرمی بڑھ چکی تھی اور گراؤنڈ میں زیادہ دیر کھلے آسمان کے نیچے بیٹھنا

مشکل ہو گیا تھا کہ باتوں باتوں میں سائنس کا ذکر شروع ہو گیا۔ اسے اس بات کا علم تھا کہ میں یونیورسٹی میں جیالوجی پڑھ رہا ہوں اس لیے بات جنرل سائنس سے ہوتی ہوئی جیالوجی اور پھر ایٹم بم تک آ گئی۔ 'پیجی' چونکہ نشہ میں تھا البتہ بظاہر اپنے آپ کو مکمل کنٹرول میں رکھ کر بات کر رہا تھا لیکن جوں جوں سائنس اور جیالوجی اور زیرِ زمین ایٹم بم کے تجربات کی بات زور پکڑتی گئی، ویسے ویسے 'پیجی' کے نشے کی حالت اور خیالات واحساسات بدلنے شروع ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ یکسوئی کی حالت حاصل ہونے کے بعد 'پیجی' جو کہ آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا، پہلے آلتی پالتی والی پوزیشن بدل کر اکڑوں پیروں پر بیٹھا اور اس کے بعد مجھے جب اس نے یہ پوچھا کہ سنا ہے ہندوستان اور دوسرے ایٹمی ممالک نے اپنے اپنے ایٹم بم زمین میں دفن کیے ہوئے ہیں یا سٹور کیے ہوئے ہیں تو ماتھے پر بل لا کر ہونٹ سکیڑ کر انتہائی خوف زدگی کے عالم میں مجھ سے پوچھا، 'عباس اگر یہ بم زمین کے اندر سٹور کیے ہوئے ہیں تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گرمیوں میں جب بے تحاشا گرمی ہوتی ہے تو گرمی کی برداشت نہ لاتے ہوئے یہ خود بخود ہی پھٹ جائیں اور ہر طرف تباہی و بربادی پھیل جائے۔' یہ کہہ کر اکڑوں پوزیشن میں تو تھا ہی، اپنے دونوں ہاتھوں میں دونوں جوتیاں پکڑ لیں اور یکدم اٹھ کر دوڑ لگا دی، یہ کہتے ہوئے کہ اس دفعہ تو گرمیاں بھی خوب پڑنی ہیں، بھاگو بھاگو اپنے آپ کو بچاؤ۔

پیجی کرکٹ بھی بہت اچھا کھیلتا تھا، خاص طور پر نیا بال درمیانی رفتار کے ساتھ سوئنگ کرنے کا فن جانتا تھا۔ شروع شروع میں اپنے رہائشی بلاک D کی ٹیم

میں باقاعدہ ممبر کی حیثیت سے کھیلتا تھا لیکن بعد میں جب بلاک D کی ٹیم ختم ہو گئی تو پیجی کی کرکٹ بھی تھم گئی۔ جب فاروق اعظم کرکٹ ٹیم کی تشکیلِ نو ہوئی اور اس ٹیم کے ممبران اچھی کرکٹ کھیلنے لگے تو پیجی نے پہلے پہل اس ٹیم کے ہمراہ بطور تماشائی اور سپورٹر کے کرکٹ کے میدانوں میں جانا شروع کر دیا۔ پھر آہستہ آہستہ موقع محل کی مناسبت سے کرکٹ کے میچ بطور کھلاڑی بھی کھیلنا شروع کر دیے اور زیادہ تر باؤلنگ کے شعبے میں اپنی کارکردگی دکھانا شروع کی۔ پھر ایک دن یوں ہوا کہ پیجی کو نیا بال دے دیا گیا اور ایک اچھی خاصی ٹیم کے خلاف بطور فرسٹ اٹیک باؤلر کے آزمایا گیا۔ پیجی نے تو کمال ہی کر دیا۔ چالیس اوور کے میچ میں اپنی بہترین سوئنگ باؤلنگ کا مظاہرہ کیا اور مخالف ٹیم کو بیس اوورز میں ہی فارغ کر دیا۔ اس میچ میں پیجی نے چھ کھلاڑیوں کو آؤٹ کیا اور خوب داد سمیٹی۔ اس نے انتہائی پُرجوش باؤلنگ کا مظاہرہ کیا اور جیسے جیسے کھلاڑی آؤٹ ہوتے گئے پیجی ویسے ویسے ایک خطرناک باؤلر اور بعد میں تقریباً (unplayable) باؤلر بن گیا۔ ہماری کرکٹ ٹیم یہ میچ بآسانی جیت گئی اور اس جیت کا سبب پیجی کی باؤلنگ قرار دیا گیا۔ بعد میں پیجی اپنی اس کارکردگی کو لے کر ایک مقامی اخبار کے دفتر گیا اور ان کو سپورٹس والے صفحے میں بطور خبر لگوا کر آیا۔ پیجی بعد میں کئی دن تک یہ کھیلوں کا صفحہ لوگوں کو دکھاتا رہا کہ دیکھو میں نے چھ آؤٹ کیے ہیں۔ اسی کارکردگی کو بنیاد بنا کر جب دوسرے میچوں میں پیجی کو نیا بال دیا گیا تو پیجی کی باؤلنگ بُری طرح پٹی اور ہم لوگ اکثر میچ ہارتے گئے۔ بعد میں ہم سب ممبران نے باقاعدہ پروٹوکول دے

کر پیجی کی کرکٹ سے ریٹائر منٹ کروائی کیوں کہ ہم اتنے زیادہ میچ پیجی کی باؤلنگ کے تجربات کی بھینٹ نہیں چڑھوا سکتے تھے۔

لیکن پیجی کو کرکٹ سے والہانہ لگاؤ تھا اور اس کا مظاہرہ وہ بارہا کر چکا تھا۔ ایک نہ بھولنے والا واقعہ بتاتا چلوں۔ برسات کے ایام میں خاص کر جولائی اور اگست میں میچ سے ذرا پہلے یا درمیان میں آناً فاناً بارش شروع ہو جاتی جس سے گراؤنڈ اور پچ کے آس پاس کا علاقہ کھیلنے کے قابل نہ رہتا لیکن جوشِ کرکٹ کا تقاضا کچھ اور تھا کہ میچ کھیلا جائے یا اگر درمیان میں ہے تو پورا کیا جائے۔ چنانچہ گراؤنڈ میں جہاں جہاں پانی جمع ہو جاتا وہاں سے بالٹیوں کے ذریعے جمع کر کے باہر نکالا جاتا اور تھوڑی ہوا یا بعد میں دھوپ نکلنے کی صورت میں گراؤنڈ کو کھیلنے کے قابل بنایا جاتا۔ اسی طرح ایک روز بارش کی وجہ سے کرکٹ پچ اور اس کا باؤلنگ اینڈ بری طرح متاثر ہوا۔ پانی جمع ہو گیا اور کھیلنے کے قابل نہ رہا۔ تو پہلے تو پیجی نے بالٹیوں اور چھوٹے چھوٹے مگوں سے پانی باہر نکالنے کے عمل میں بڑھ چڑھ کے ساتھ دیا مگر معاملہ حل نہ ہوا تو اپنی قمیض اتاری اور اس کو پانی میں بھگو بھگو کر گراؤنڈ سے باہر لے جاتا وہاں بھیگی ہوئی قمیض کو خوب نچوڑتا۔ پھر واپس پچ پر آتا، دوبارہ قمیض کو پانی سے بھگو کر بھرتا اور پھر واپس باہر نچوڑ کر آتا۔ اس عمل میں پیجی کو تمام لوگ حیرت سے دیکھتے اور پیجی کی کرکٹ کے ساتھ محبت کو سراہتے رہے۔ بعد میں پیجی کا یہ طریقۂ کار کامیاب ہو گیا اور باقی ماندہ میچ مکمل ہوا۔ مدتوں تک پیجی کا یہ عمل لوگوں کی زبان میں تازہ رہا اور مسرت کا باعث بنا رہا۔

باب سوم

# کرکٹ کی شروعات اور چشم دیدیاں

کرکٹ کے کھیل کا جنون سر پر چڑھنے کا آغاز 1969 کو پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس کی گراؤنڈ میں قائداعظم ٹرافی کے ایک میچ کو دیکھنے سے ہوا۔ اس کھیلے گئے میچ میں ایک طرف حنیف برادران تھے اور دوسری طرف سرفراز نواز۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک جمِ غفیر تھا جو یہ میچ دیکھ رہا تھا۔ ساتھ ہی مختلف قسم کے کھانوں کی اشیاء کے سٹال اور پھیری والے تھے جو گھوم پھر کر پاپڑ، مولی گاجر، مونگ پھلی، ریوڑی وغیرہ بیچ رہے تھے۔ گراؤنڈ کے اندر حنیف برادران اپنے بلے بازی کے جوہر دکھا رہے تھے اور باوجود کوشش کے جو باؤلرز کی طرف سے مسلسل آؤٹ کرنے کی صورت میں تھی، وکٹ نہیں دے رہے تھے۔ میں نے سرفراز نواز کو سر توڑ کوشش کرتے دیکھا اور پھر یہ بھی دیکھا کہ انھوں نے دائیں ہاتھ سے باؤلنگ چھوڑ کر بائیں ہاتھ سے کرنا شروع کر دی لیکن حنیف برادران جو غالباً حنیف محمد اور مشتاق محمد تھے، وہ آؤٹ نہ ہوئے۔ بس یہیں سے کرکٹ کا شوق

پروان چڑھااور وہ ہیرو جن کی تصاویر کو اخبارات میں دیکھتے یا جن کے کھیل کو ریڈیو پہ کمنٹری میں سنتے، وہ بالکل سامنے تھے۔

شاید یہ 1969 کا ہی واقعہ ہے کہ نیوزی لینڈ اور پاکستان کی کرکٹ ٹیموں کا ٹیسٹ میچ قذافی سٹیڈیم میں جو اس وقت نیشنل سٹیڈیم لاہور تھا، کھیلا جارہا تھا۔ اور پی ٹی وی نے وہ میچ براہ راست دکھانا شروع کر دیا۔ اس میچ کی خاص بات شفقت رانا کی بے مثال اور بہادرانہ اننگ تھی جو انھوں نے بے مثال طریقے سے کھیلی۔ بدقسمتی سے وہ اپنی سنچری بنا سکے اور نہ پاکستان کو یہ میچ جتوا سکے۔ اس میچ نے اتنا اثر کیا کہ میں صحیح معنوں میں کرکٹ کا نشئی ہو گیا۔ جب جب جہاں جہاں پاکستان کا میچ ہوتا اور ریڈیو یا ٹی وی سے نشر ہو رہا ہوتا، میرے لیے ممکن نہ تھا کہ میں اس کو چھوڑ سکوں۔ 1974 کو پاکستان اور انگلستان کے درمیان دو ODI کھیلے گئے اور دونوں پاکستان نے جیت لیے۔ آتشِ شوق مزید بڑھی، یہاں تک کہ 1975 میں پہلا کرکٹ ورلڈ کپ انگلستان میں منعقد ہوا۔ اس میں پاکستان اور ویسٹ انڈیز کی ٹیموں کے درمیان کانٹے دار مقابلہ ہوا جو پاکستان ایک وکٹ سے ہار گیا۔ دل بہت ملول ہوا کیونکہ اب کرکٹ میچ پاکستان جیتتا تو میرا موڈ خوشگوار ہوتا، اگر ہارتا تو ایسے لگتا جیسے کوئی بہت قریبی عزیز فوت ہو گیا ہو۔ پھر یہ ہوا کہ 1976 میں پاکستان آسٹریلیا گیا، وہاں عمران خان کا ستارہ چمکا اور اس کی باؤلنگ کے دلکش سٹائل اور مسحور کن کارکردگی نے پورے پاکستان میں کرکٹ کا نشہ پھیلا دیا۔ ہر طرف بچے بڑے گلیوں محلوں میں بیٹ بال لیے پاکستان کرکٹ ٹیم کے سپر سٹار کا

روپ دھارے نظر آنے لگے۔ خاص طور پر جب عمران خان نے 1978 میں کراچی ٹیسٹ میں بِشن سنگھ بیدی کو فیصلہ کن میچ میں لگاتار دو چھکے مارے اور پھر 1984 میں عمران خان کی تیز اور ہوا میں تیرتی باؤلنگ نے سنیل گواسکر، وشواناتھ، دلیپ ونگسارکر اور چوٹی کے بلے بازوں کو پویلین کی راہ دکھائی تو پورا ملک کرکٹ کا شیدائی ہو گیا۔ اور جب ورلڈ کپ کے تہوار آنے لگے تو ویسے ویسے کرکٹ کا کھیل ترقی پانے لگا اور ہمارے دوسرے کھیل کرکٹ کے مقابلے میں چھپنے لگے۔ 1983 کا ورلڈ کپ ہندوستان جیت گیا۔ جاوید میانداد کے 1986 میں شارجہ کے میدان میں لگایا گیا چھکا اور پاکستان ہندوستان کی سرزمین پر کھیلا گیا 1987 کا ورلڈ کپ۔ پاکستان اس ورلڈ کپ میں آسٹریلیا سے سیمی فائنل مقابلہ لاہور کے قذافی سٹیڈیم میں ہار گیا اور عمران خان نے بددل ہو کر کرکٹ سے استعفیٰ دے دیا۔ ساری قوم میچ ہارنے پر افسردہ ہو گئی اور عمران خان کے استعفیٰ نے قوم کو مزید مایوس کر دیا لیکن اس وقت کے حکمران ضیاء الحق نے عمران خان کو دوبارہ کرکٹ کھیلنے کے لیے رضامند کر لیا۔ اب تو بات یہاں تک پہنچ گئی کہ ٹی وی شوز، ریڈیو پروگرام، اخبارات کی رنگین اشاعت پر قومی کرکٹر کی بڑی بڑی تصاویر شائع ہونا شروع ہو گئیں۔ سینماؤں میں ہر فیچر فلم سے پہلے کرکٹ میچوں کی جھلکیاں دکھائی جانی شروع ہو گئیں۔ پورا پاکستان کرکٹ کے بخار اور محبت میں جکڑا گیا۔ پاکستان 1992 کا ورلڈ کپ عمران خان اور جاوید میانداد کی ذمہ دارانہ کھیل کی بدولت جیت گیا اور پاکستان کرکٹ ٹیم کو نئے نئے ہیرو وسیم اکرم، وقار

یونس، سعید انور، عامر سہیل، انضمام الحق جیسے عمدہ کھلاڑی مل گئے۔ پاکستان 1996 کا ورلڈ کپ انڈیا میں ہارنے کے بعد 1999 کے ورلڈ کپ میں فائنل میں آسٹریلیا سے ہار گیا۔ غرض یہ کہ کرکٹ کے مدوجزر کی ایک لمبی داستان ہے جس نے پوری قوم کو جو کسی امر میں متفق ہو نہ ہو لیکن کرکٹ کے کرنٹ کے ساتھ ناقابلِ یقین حد تک چمٹ گئی۔ کرکٹ میں قومی ٹیم کے مدوجزر کو تو کوئی کھیل کے امور میں مہارت رکھنے والا صحافی نہایت اچھی طرح بیان کر سکتا ہے۔ میرا تو مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ میں بھی کرکٹر بننے کے خواب دیکھنے لگا اور اپنے جیب خرچ کو نہایت احتیاط سے خرچ کرنے لگا۔ زیادہ تر رقم بچا بچا کر اور والدِ محترم سے مزید رقم مختلف بہانوں سے اکھٹی کر کے بہترین بلّا خریدا۔ ساتھ ہی کرکٹ کھیلنے کا یونیفارم بھی جس میں سفید شرٹ اور ٹراؤزر بمعہ باؤلنگ سپائیکس شامل تھے، غرض یہ کہ میں اور میرے چھوٹے بھائی عبدالرزاق قریشی نے کرکٹ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔

مزید براں، ہمارے محلے میں ایک فرسٹ کلاس کرکٹ کھلاڑی ذاکر بٹ صاحب رہتے تھے۔ جو زیادہ تر ریلوے کی طرف سے قائداعظم ٹرافی کھیلتے تھے۔ ذاکر بٹ وکٹ کیپر بیٹسمین تھے اور انگلستان کے خلاف راولپنڈی میں پریذیڈنٹ الیون کی طرف سے کھیلے بھی تھے۔ ذاکر بٹ بہت اچھے بلے باز تھے اور جب نیٹ میں آتے تو بڑی بڑی ہٹ لگاتے اور ہم ان کو نیٹ کے پیچھے سے دیکھتے رہتے۔ پھر ایک وقت یہ آیا کہ میں ان کو صبح صبح کرکٹ بال سے سیمنٹ وکٹ پر پریکٹس

کرواتا۔ اس پریکٹس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مجھے تیز گیند کروانا اور سوئنگ کرنا وغیرہ آگیا۔ پھر جہاں ذاکر بٹ کا میچ ہوتا جو عموماً قذافی سٹیڈیم یالاہور جم خانہ میں ہوتا یا کبھی کبھی ریلوے انسٹیٹیوٹ (کارسن) کی گراؤنڈ میں تو میں وہاں ان کا میچ دیکھنے ضرور جاتا۔ وہاں پر نامور پاکستانی کرکٹر جیسے عمران خان، آصف مسعود، سرفراز نواز، وسیم باری، ظہیر عباس، ماجد خان، مدثر نذر اور ان گنت کھلاڑیوں کو نہ صرف دیکھنے کا موقع ملتا بلکہ چند ایک سے تعارف بھی ہو جاتا۔ سرفراز نواز انتہائی دلچسپ شخصیت کے مالک ثابت ہوئے جو بہت باتونی تھے۔ کھیل اور سیاست دونوں میں دلچسپی رکھتے تھے۔ سلیم پرویز ایک بہترین کرکٹر رہے ہیں جو شروع شروع میں ریلوے کی طرف سے کھیلتے تھے، بعد میں نیشنل بنک کی طرف سے کھیلنا شروع ہو گئے۔ کیا ہی غضب کے بلے باز تھے۔ شاید ایک یا دو ODI میں پاکستان کی ویسٹ انڈیز کے خلاف نمائندگی بھی کی اور کافی دیر تک وکٹ پر کھڑے رہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ویسٹ انڈیز میں سر ویون رچرڈز، کالی چرن، میلکم مارشل، اینڈی رابرٹس، کولن کرافٹ جیسے قد آور کھلاڑی ہوتے تھے۔ سلیم پرویز لاہور کے ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور کوئی خاص تعلیمی سند بھی نہیں تھی صرف بلے بازی تھی اور بلے بازی بھی اس زمانے کے لحاظ سے بہت جارحانہ، کسی تیز باؤلر کو خاطر میں نہ لاتے۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ میں اور میرے کچھ کلاس فیلوز پی آئی اے اور نیشنل بینک کی کرکٹ ٹیموں کا میچ دیکھنے قذافی سٹیڈیم گئے۔ ابھی ہم گیٹ میں داخل ہو کر نیچے گراؤنڈ کے ارد گرد لگے

جنگلے تک بھی نہ پہنچے تھے کہ ایک دم ٹھک کی آواز آئی اور نیا بال ہمارے پاس آ گرا۔ بال ایک دو ٹپے کھانے کے بعد حالتِ سکون میں آیا تو میں نے پکڑ کر گراؤنڈ میں فیلڈر کے حوالے کر دیا۔ لیکن جب معاملے کو بغور دیکھا تو معلوم ہوا کہ جناب عمران خان صاحب باؤلر ہیں اور انھوں نے سلیم پرویز کو شارٹ پچ بال دی جس کو سلیم پرویز نے ہُک شارٹ کھیلا اور بال کافی اوپر ہوا میں پروجیکٹائل موشن کے ساتھ قذافی سٹیڈیم کی گراؤنڈ کو کراس کرتے ہوئے سیڑھیوں کے پاس جا کر گرا۔ یاد رہے یہ ان دنوں کی بات ہے جب عمران خان نئے نئے آسٹریلیا کا کامیاب ٹوور کر کے آئے تھے اور ایک دیو مالائی کردار کی طرح مشہور ہو گئے تھے۔ سٹیڈیم میں اچھے خاصے تماشائی تھے کیونکہ دونوں ٹیموں کی طرف سے نامور کھلاڑی جیسے پی آئی اے سے ماجد خان، مدثر نذر، مشتاق محمد، عمران خان، آصف مسعود اور وسیم باری وغیرہ اور نیشنل بینک کی طرف سے تسلیم عارف، شفیق پاپا، سلیم پرویز، علی ضیا، احتشام الدین اور دوسرے کھلاڑی تھے۔ بہرحال ہم بھی بیٹھ کر میچ دیکھنے لگ پڑے۔ اس سے زیادہ بہتر میچ میں نے قائداعظم ٹرافی کا پہلے نہیں دیکھا تھا۔ سلیم پرویز نے عمران خان اور آصف مسعود دونوں کی خوب ٹھکائی کی۔ سلیم پرویز ویسے بھی قد کاٹھ رکھنے والے کھلاڑی تھا اور جس طرح کنگ کانگ کا کردار فلموں میں گاڑیوں اور ہیلی کاپٹر کو چر مر کر دیتا ہے ویسے ہی سلیم پرویز جہاں بال گرے اس کو وہیں سے اٹھا اٹھا کر بلکہ پٹخ پٹخ کر باؤنڈری کے باہر پھینک رہا تھا۔ یہاں پر ایک بات اور دیکھنے والی تھی کہ دوسرے اینڈ سے

کوئی بھی بلے باز سلیم پرویز کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ دیتا بھی کیسے؟ عمران خان نے سب کو ڈرایا ہوا تھا اور وہ بڑے آرام سے وکٹ ہاتھ میں تھما کر پویلین کی طرف جارہے تھے۔ صرف ایک ہی شیر تھا سلیم پرویز جو دونوں اینڈ پر ڈٹا ہوا تھا اور چھینٹا لگا رہا تھا۔ کرتے کرتے نیشنل بینک کی ساری ٹیم شاید 118 رن پر آؤٹ ہوگئی جس میں 86 رنز اکیلے سلیم پرویز کے تھے۔ نیشنل بینک یہ میچ بری طرح ہار گیا لیکن سلیم پرویز کی بیٹنگ نظارہ دے گئی۔

ذاکر بٹ اور سلیم پرویز کی گہری دوستی تھی۔ ویسے بھی یہ کرکٹر ایک دوسرے کے دوست اور جاننے والے ہوتے ہیں۔ میں اور ذاکر بٹ ایک دفعہ سلیم پرویز کو ملنے اس کے گھر گئے جو بادشاہی مسجد کے نزدیک ہی تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا کیونکہ یہ علاقہ ٹکسالی تھانہ کے نزدیک تھا اور میں چند نامعلوم خدشات کو محسوس کرتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہوا۔ وہاں کا منظر میرے خدشات کو تقریباً سچ ثابت کر رہا تھا۔ ہوا یوں کہ جب میں اور ذاکر بٹ ایک ہال نما کمرے میں داخل ہوئے تو وہاں بھنگ کا دور چل رہا تھا۔ بڑے بڑے کٹوروں میں بھنگ وہاں پر بیٹھے لوگوں میں تقسیم کی جارہی تھی۔ یہ رمضان شریف کا مہینہ تھا اور میں روزے سے تھا۔ میں اور ذاکر بٹ سلیم پرویز کی نشست کے ساتھ دائیں طرف کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ السلام علیکم، وعلیکم السلام کے بعد سلیم پرویز جو بہت کم کم بات کرتا تھا لیکن اس دن بڑے فراخدلانہ انداز میں مجھے بتانے لگا کہ عباس! میں نے تمھارے محسن کمال اور علی احمد خان دونوں کو خوب چھینٹا لگایا۔ سلیم پرویز

غالباً اس میچ کی بات کر رہے تھے جو قذافی سٹیڈیم کے ساتھ والی گراؤنڈ میں نیشنل بینک اور لاہور کرکٹ ایسوسی ایشن کے مابین ہوا تھا اور اس میچ میں واقعی محسن کمال اور علی احمد خان (انڈر 19 پاکستانی باؤلر جو انڈیا میں اچھا کھیلا تھا) کو سلیم پرویز نے چھٹی کا دودھ یاد کروایا تھا۔ میں نے وہ میچ دیکھا تھا اور جس طرح سلیم پرویز دونوں کا کٹارا لگا رہا تھا، ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے نیٹ پریکٹس ہو رہی ہے۔ دونوں نونہالوں کا حال دیکھنے والا تھا۔ سلیم پرویز T-20 فارمیٹ جو غالباً اس میچ سے تیس چالیس سال بعد متعارف ہوا تھا، کی طرح کھیل رہا تھا۔ یوں سمجھیں وہ دونوں کی خوب بے عزتی کر رہا تھا اور دبے لفظوں میں سمجھا رہا تھا کہ یا تو کرکٹ کھیلنا چھوڑ دو یا خوب محنت کرو۔

میں نے سلیم پرویز کو بتایا کہ ہاں، وہ میچ میں نے دیکھا تھا اور میں جانتا ہوں کہ ان دونوں کا جو آپ نے حال کیا تھا۔ باتوں کے دوران ایک شخص بھنگ کا پیالہ میرے پاس لایا اور بظاہر مجھے بھی باقی لوگوں کی طرح سمجھا۔ ابھی پیالہ اس کے ہاتھ میں ہی تھا کہ سلیم پرویز بجلی کی چمک کی طرح اٹھا۔ چھلانگ لگائی اور اس شخص سے پیالہ چھینا اور پنجابی میں بولا؛ 'بندہ کبندہ ویکھ لیا کرو۔' یعنی بندوں کی شناخت کر لیا کرو۔ سلیم پرویز کا قد تقریباً پونے سات فٹ اور باڈی فریم اچھا خاصا تھا۔ جس تیزی سے وہ لپکا اور اس نے بھنگ کا پیالہ اس شخص سے چھینا، قابلِ داد تھا۔ اسی دوران ایک صاحب جن کا رنگ میری طرح ہی کچھ کچھ پکا تھا اور ہاتھوں میں بلکہ دونوں ہاتھوں میں انگوٹھیاں پہن رکھیں تھیں، تشریف لائے۔ غور سے

دیکھا تو مشہور فلم ایکٹر اقبال حسن تھے۔ ان کے ساتھ بھی اُدھر ہی تعارف ہوا۔ بعد میں سلیم پرویز کے ساتھ بس اسی طرح کی ملاقاتیں رہیں اور وہ بھی کرکٹ گراؤنڈ میں۔ کچھ عرصہ ہوا ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں غریقِ رحمت ہو گئے۔

## جنونِ کرکٹ اور اس کی تباہ کاریاں

پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ بلاشبہ میرٹ پر ہوا تھا لیکن اس میں کرکٹ کی محبت کا بھی مثبت ہاتھ تھا۔ پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس اور نیو کیمپس کی کرکٹ گراؤنڈز انتہائی خوبصورت اور دل کو بھانے والی تھیں۔ کرکٹ کی وجہ سے ایف ایس سی میں جو دھچکا لگا تھا، ہونا تو یوں چاہیے تھا کہ اس کھیل کو چھوڑ دیا جاتا لیکن جب ظہیر عباس، ماجد خان، سرفراز نواز، جاوید میانداد اور سب سے بڑھ کر عمران خان جیسے سپر سٹارز اور ان کے کارنامے خاص طور پر انڈیا کے خلاف جو کیے گئے، دیکھے تو آتشِ شوق ختم ہونے کے بجائے مزید بڑھتی گئی اور خود بھی ان کی طرح بننے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ سر کے بال عمران خان اور سرفراز نواز کی طرح بڑھا لیے اور بیٹنگ میں ماجد خان جو مائٹی خان کے نام سے مشہور تھے کی نقل کرنا شروع کر دی۔ غرضیکہ کرکٹ کے میچ ٹیلی ویژن سے براہ راست دیکھتے دیکھتے اس کھیل کو اپنے اوپر طاری کر لیا اور پھر وہی بات کہ پڑھائی کم سے کم ہوتی گئی جبکہ دن کی کرکٹ تو جاری تھی ہی، اب رات کو فلڈ لائٹ میں ٹینس بال کرکٹ کا جنون بھی موجیں مارنا شروع ہو گیا۔ یہ شوق کم بخت اتنا بڑھا کہ کوئی اور ہوش ہی نہ رہا۔ پھر لاہور میں NCA کے ہاسٹل کے اندر ایک چھوٹی سی گراؤنڈ میں اتحاد

کپ شروع ہو گیا۔ اس کپ کے ونر کو گولڈ میڈل کے ساتھ 50 ہزار روپے انعام بھی ملتا تھا۔ اس اتحاد کپ کو اتنی پذیرائی ملی کہ لاہور میں جگہ جگہ فلڈ لائٹ ٹینس بال کرکٹ ٹورنامنٹ ہونا شروع ہو گئے اور جنون ایسا تھا کہ یہ کوشش ہوتی کہ کوئی بھی ٹورنامنٹ رہ نہ جائے بلکہ ہر ٹورنامنٹ میں شرکت کی جائے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ جیالوجی کی پڑھائی بری طرح متاثر ہوئی اور کچھ مضامین میں سپلی آنا شروع ہو گئی۔ آتشِ شوق اتنی بھڑکی کہ امتحان چھوڑ کر کرکٹ میچ کو فوقیت دی جانے لگی۔ (اسی دوران انٹر ڈیپارٹمنٹل کرکٹ چیمپئن شپ کا انعقاد جو ہر سال ہوتا تھا، اس پر خصوصی توجہ دینا شروع کر دی۔)

اب اس بات کو کون عقل مندی کہے گا کہ جس دن سالانہ امتحان میں فزکس کا پریکٹیکل تھا اسی دن اپنے کلب وحدت ایگلٹس کی طرف سے وحدت کالونی گراؤنڈ میں کرکٹ کا میچ کھیل رہا تھا۔ میچ میں کارکردگی اچھی دکھائی جس کی بنا پر میچ تو جیت لیا لیکن فزکس کے امتحان میں جناب مجاہد کامران صاحب نے جو اس وقت ہمارے فزکس کے پروفیسر تھے اور بعد میں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے، فیل کر دیا۔ پروفیسر صاحب چونکہ نئے نئے ڈاکٹریٹ کر کے آئے تھے اور ڈسپلن کے سخت تھے، اس لیے ان پر کسی بھی منت وسماجت کا اثر نہ ہوا اور زندگی میں پہلی بار ایک مضمون میں فیل ہونے کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ وحدت ایگلٹس میں کھیلتے ہوئے کئی نونہالانِ کرکٹ کا ساتھ رہا جن میں محسن کمال، سہیل فضل، عاطف رؤف اور ان گنت کرکٹر بعد میں پاکستان کرکٹ ٹیم

کے لیے بھی کھیلے۔ غرضیکہ کرکٹ کے بخار اور جنون نے بری طرح جکڑ لیا ہوا تھا اور ہارڈ بال کرکٹ، سافٹ بال کرکٹ، سفید بال کرکٹ، کوئی بھی کرکٹ چھوٹی ہوئی نہ تھی۔

پھر ایک دن انٹر کالجیٹ کرکٹ ٹورنامنٹ میں وہی فزکس کا پریکٹیکل جو رہ گیا تھا، اس کی ڈیٹ شیٹ آگئی اور قسمت دیکھیں کہ جس دن فزکس کا پریکٹیکل تھا اسی دن لا کالج یا علامہ اقبال میڈیکل کالج کے ساتھ یونیورسٹی گراؤنڈ میں میچ تھا۔ ہمارے سپورٹس ڈائریکٹر بابا یعقوب تھے۔ بڑے ہی ہر دلعزیز اور سپورٹس کے ساتھ پیار کرنے والے۔ مجھے کہنے لگے: 'عباس کوئی بات نہیں، تم میچ کھیلو ہم تمھارا پیپر دوبارہ دلوا دیں گے۔' مجھے اور کیا چاہیے تھا۔ بھرپور تیاری کے ساتھ میچ کھیلا اور جیتے بھی۔ اب جب پیپر دینے کی بات ہوئی تو جناب پروفیسر مجاہد کامران صاحب نے ایک بار پھر سٹینڈ لے لیا اور باوجود ڈائریکٹر سپورٹس کی کوششوں کے بالکل راضی نہ ہوئے۔ نتیجتاً مجھے تیسری اور آخری کوشش میں فزکس کا پیپر پاس کرنا پڑا۔ اس بے قاعدگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ BSC میں سیکنڈ ڈویژن آئی جو بعد میں عملی اور پیشہ ور زندگی میں اپنا اثر دکھاتی رہی اور میرے لیے پچھتاوے کا باعث بنی رہی۔

انٹر ڈیپارٹمنٹل کرکٹ ٹورنامنٹ یونیورسٹی کی حسین یادوں میں ہم کرکٹ کے شیدائیوں کے لیے ایک خاص مقام رکھتا تھا۔ سارے تو نہیں لیکن ایک درجن کے قریب ڈیپارٹمنٹس کے طالب علم اس میلہ میں بڑی گرم جوشی کے ساتھ حصہ لیتے تھے جو کہ زیادہ تر باقاعدہ کرکٹ سے وابستہ تو نہیں ہوئے تھے

لیکن اپنے چند ایک ساتھیوں کے ہمراہ اس ایک ہفتہ کی تفریح کا بھرپور مزہ لیتے تھے۔ ویسے بھی یہ ٹورنامنٹ دسمبر کے مہینہ میں جو کہ لاہور کا بہترین موسم ہے، میں منعقد ہوتا تھا۔ ہر طرف دھوپ کی سنہری اور ٹھنڈی میٹھی کرنیں بکھری ہوتی تھیں اور بالکل عید کا سماں پیدا کر رہی ہوتی تھیں۔ ان درجن بھر ڈیپارٹمنٹس میں چند ہی ڈیپارٹمنٹس کی ٹیمیں اچھے کھلاڑیوں پر مشتمل ہوتی تھیں جن میں MPA, MBA ، کیمیکل انجینئرنگ یا جیالوجی کی ٹیمیں تھیں۔ ان میں جیالوجی کی کرکٹ ٹیم سب سے زیادہ پُرجوش اور فعال سمجھی جاتی تھی۔ کیونکہ ہم جیالوجی کے لڑکوں کے پاس وافر وقت ہوتا تھا اس لیے سارا سال کرکٹ اور دوسری کھیلوں میں گرم جوشی کے ساتھ شرکت بھی ہوتی اور ساتھ ساتھ پڑھائی بھی۔ فیلڈ سٹڈی جیسی نعمت جس میں ہم پورے پاکستان کے حسین اور دلکش علاقے دیکھتے، وہاں کی سیر و تفریح کرتے اور ساتھ معلوماتی پروگرام سے خوب محظوظ ہوتے، بھی شامل تھی۔

انٹر ڈیپارٹمنٹل کرکٹ ٹورنامنٹ میں یوں تو جیالوجی کے لڑکوں کی کارکردگی ہمیشہ سے مثالی رہی لیکن اس دفعہ چونکہ ہماری ٹیم میں ضمیر الاحسن، طارق محمود بٹ، آصف کریم، محمد سہیل، نبیل امان مرزا، نصیر شفیق اور میرے علاوہ اور بھی کئی ایسے لڑکے تھے جو نہ صرف کرکٹ کے کھیل سے دلچسپی رکھتے تھے بلکہ اس کو کھیلنے میں مہارت بھی رکھتے تھے چنانچہ اس ٹورنامنٹ کو جیتنے کا پروگرام بنایا گیا جس کے لیے ہم جیالوجی والوں نے اپنے اپنے تئیں تو خوب تیاری

کی لیکن ساتھ ساتھ پریکٹس میچ بھی کھیلنا شروع کر دیے۔ پریکٹس میچ ہم اپنی یونیورسٹی کے دوسرے ڈیپارٹمنٹ کی ٹیموں کے ساتھ تو کھیل ہی رہے تھے لیکن کھیل کے معیار اور اپنے اعتماد کو مزید بڑھانے کے لیے لاہور کی دوسری مشہور کرکٹ کلب کی ٹیموں کے ساتھ میچ رکھنا شروع کر دیے۔

## دہشت میچ

ان ہی پریکٹس میچوں کے سلسلے میں مَیں نے وحدت ایگلٹس کے اُس وقت کے کپتان اور اپنے دوست خالد نصیر سے بات کی کہ پنجاب یونیورسٹی کی گراؤنڈ مَیں بُک کرواتا ہوں اور آپ اپنی ٹیم لے کر مقررہ دن مقررہ وقت پر تشریف لے آئیں اور ہماری جیالوجی کی ٹیم کے ساتھ پریکٹس میچ کھیلیں۔ خالد نصیر نے میری بات مان لی اور حسبِ وعدہ اپنی بہترین ٹیم جو کہ محسن کمال، عامر نسیم، سہیل فضل اور ان گنت فرسٹ کلاس کرکٹرز پر مشتمل تھی، پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس کی درمیانی کرکٹ گراؤنڈ میں لے آئے۔

محسن کمال ایک تیز رفتار باؤلر تھے اور بالکل نئے نئے کرکٹ کی دنیا میں متعارف ہوئے تھے۔ میرے ساتھ ہی وحدت ایگلٹس میں کھیلتے تھے۔ انھوں نے انڈر 19 لیول سے کرکٹ شروع کی تھی اور اپنے خوبصورت باؤلنگ ایکشن کی وجہ سے جلد ہی لاہور کرکٹ میں مشہور ہو گئے تھے اور بہت جلد پاکستان کے سٹار بولرز میں شمار ہونے لگ گئے۔ عامر نسیم بھی کچھ کم نہ تھے بلکہ رفتار میں محسن کمال کے ہم پلّہ اور بال پر کنٹرول اور سوئنگ کرنے میں محسن کمال سے زیادہ فعال۔ اسی طرح

سہیل فضل جو کہ پاکستان کی طرف سے بعد میں ODI بھی کھیلے۔ خالد نصیر صاحب خود بہترین لیفٹ آرم سپنر تھے غرضیکہ میں نے جب اس ٹیم کے لڑکوں کو دیکھا تو میرا ماتھا ٹھنکا کہ یہ ٹیم تو ایک طرح سے فرسٹ کلاس کرکٹ میچ کھیلنے کی نیت سے آئی ہے پریکٹس میچ کھیلنے کی نیت سے نہیں آئی، بلکہ بات کچھ اور ہی ہے۔ ایک طرف سارے تقریباً پروفیشنل کرکٹ کھیلنے والے اور دوسری طرف میری ٹیم بالکل طفلِ مکتب جو پڑھائی اور باتوں میں تو شاید کسی کو بھی مات دے سکے لیکن بال اور بیٹ کی باقاعدہ جنگ میں کسی طور پر مقابلہ کے قابل نہیں۔ میں تو اپنے کلب کے لڑکوں کو جانتا تھا اس لیے مجھے چپ سی لگ گئی لیکن میرے ڈیپارٹمنٹ کے لڑکے بہت خوش کہ پاکستان کے اعلیٰ درجے کے کرکٹر ہمارے ساتھ میچ کھیلنے آئے ہیں اور اس بات کو وہ اپنے لیے بہت اعزاز سمجھ رہے تھے۔ میں اپنے ان ہی خیالوں میں گُم صُم تھا کہ ان کلب کے لڑکوں نے اس کو پریکٹس میچ کے طور پر نہیں کھیلنا بلکہ اپنی طاقت اور گرم جوشی والی کرکٹ دکھانے سے باز نہیں آنا۔ خدانخواستہ میری ٹیم کے کسی ممبر کو اگر کوئی زخم آگیا تو کیا ہوگا۔ اس اثنا میں ضمیر الاحسن نے مجھے کہا؛ 'عباس! یہ وحدت ایگلٹس ہے۔' تو میرے منہ سے نکلا؛ 'ہاں! لیکن یہ تو چُنے ہوئے بہترین کھلاڑی ہیں اللہ خیر کرے۔' اللہ نے واقعی خیر کی اور میں خالد نصیر کے ساتھ ٹاس کرتے ہوئے ٹاس جیت گیا اور پہلے بیٹنگ کا ارادہ ظاہر کر دیا۔ چونکہ ضمیر الاحسن اور نصیر شفیق باقاعدہ ابتدائی بلے باز کے طور پر چُن لیے گئے تھے اور ان کا دھیما مزاج اس پوزیشن کے لیے سود مند تھا، اس لیے ان

دونوں کو پیڈ اپ کر کے تیار کیا گیا اور تھوڑی دیر ہلکی پھلکی نو کنگ کروائی گئی۔ اسی اثنا میں وحدت ایگلٹس کے کھلاڑی فیلڈنگ کے لیے گراؤنڈ میں آ گئے اور تمام فیلڈرز اپنی اپنی پوزیشن پر براجمان ہو گئے۔ نیا بال محسن کمال نے اپنے ہاتھ میں سنبھالا اور اپنے فل سٹارٹ کے ساتھ باؤلنگ کے لیے تیار ہو گیا۔ ضمیر الا حسن صاحب نے سٹرائیکنگ اینڈ سنبھالا اور ایمپائر سے کریز لے کر محسن کمال کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ پہلی بال ہوا میں لہراتی ہوئی پچ پر پڑی۔ ضمیر الا حسن صاحب روایتی طریقے سے بال کو عزت کے ساتھ روکنے کے لیے بالکل کتابی انداز میں اپنی بائیں ٹانگ کو آگے بڑھانے کی کوشش میں ہی تھے کہ بال لیگ کٹ ہوتی ہوئی وکٹ کیپر کے ہاتھوں میں۔ دوسرا بال بھی ایسے ہی ضمیر صاحب کو سلامی دیتے ہوئے وکٹ کیپر کے ہاتھوں میں اور بعد میں آنے والے بال ضمیر صاحب کو سلامی دیتے ہوئے آف سائیڈ د اسٹمپ وکٹ کیپر کے دستانوں میں جاتے رہے۔ اب اندر کا حال تو ضمیر صاحب جانتے تھے لیکن باہر ہمیں صاف دکھائی دے رہا تھا کہ بیٹ اور بال کا ملاپ نہیں ہو رہا اور مڈلنگ (middling) تو بالکل نہیں ہونے جا رہی۔ اسی اثنا میں محسن کمال نے بال کے رخ کو بدلا اور بجائے بال باہر جانے کے اندر آ گئی اور غالباً ضمیر صاحب کے جسم کو لگی۔ اب تو باقاعدہ محسن کمال کبھی بال کو اندر کی طرف لاتے اور کبھی باہر نکالتے اور ضمیر صاحب فارورڈ کھیلنے جاتے یا بیک فٹ پر، دونوں صورتوں میں بال کا کچھ اندازہ نہ ہوتا۔ اللہ اللہ کرتے محسن کمال کا پہلا اوور اختتام پذیر ہوا اور دوسرے اینڈ سے زیادہ خطرناک عامر نسیم نے باؤلنگ

کروانا شروع کی۔ عامر نسیم زیادہ تر بال کو اندر لانے پر قدرت رکھتا تھا اس لیے تھوڑی سی لیگ سائیڈ پر نصیر شفیق کا بیٹ بال سے لگ گیا اور لانگ لیگ پر ایک آسان سارَن بن گیا۔ اب پھر ضمیر الاحسن کی باری تھی اور باؤلر تھا عامر نسیم۔ اب کی بار بال باہر جانے کی بجائے اندر آئے اور ضمیر صاحب کے بیٹ کے سوا ہر دوسری چیز کو لگے جس میں گلوز، چھاتی، پیٹ، غرض یہ کہ کچھ پلے نہ پڑے کہ کیا کِیا جائے۔ آگے جایا جائے کہ پیچھے جا کر کھیلا جائے۔ جو بھی موومنٹ تھی بال قابو نہ چڑھی۔ اسی طرح تین چار اوور گزر گئے اور چند ایک وائیڈ، ایکسٹرا اسکور اور کچھ عدد بلے کے کنارے سے چھوتی ہوئی لانگ لیگ یا تھرڈ مین پوزیشن پر جاتی ہوئی دوڑوں کے کوئی بھی باؤنڈری نہ ملی۔ آٹھ یا دس سکور تھے کہ نصیر شفیق اس کشمکش والی بیٹنگ سے تنگ آ کر وکٹ کیپر کے ہاتھوں کیچ آؤٹ ہو گئے۔ اور ون ڈاؤن پر جناب طارق محمود بٹ صاحب کھیلنے کے لیے آ گئے۔ طارق محمود بٹ صاحب ویسے بھی گورے چٹے اصل کشمیری اور کرکٹ کو سمجھنے والے، کھیلنے والے اور بین الاقوامی کرکٹ کو بغور مشاہدہ کرنے والے، اپنے بیٹنگ اور باؤلنگ دونوں کے ایکشن سے انگلستان کے مشہور آل راؤنڈ سر آئن بوتھم سے مشابہ تھے۔ بالکل سیدھے بیٹ سے صاف ستھری بیٹنگ کے ماسٹر، ان کو ون ڈاؤن پوزیشن پر تیار کیا جا رہا تھا۔ اس لیے نصیر شفیق کے آؤٹ ہونے کے بعد طارق محمود بٹ صاحب کیل کانٹے سے لیس ہو کر بیٹنگ کریز پر پہنچے اور ایمپائر سے گارڈ لینے کے بعد باؤلر کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ باؤلر تھے جناب عامر نسیم صاحب جو دونوں طرف بال

کو اچھی خاصی رفتار کے ساتھ گھمارہے تھے اور ردھم میں آچکے تھے۔ بال باقاعدہ سینے کی بلندی تک شُوں شُوں کر کے آجارہی تھی۔ طارق صاحب کوشش میں تھے کہ کسی طرح بال کو بیٹ کی گرفت میں لائیں لیکن مجال ہے کہ گولی کی طرح گزرتی ہوئی بال بیٹ کی زد میں آئے۔ اس کشمکش میں بٹ صاحب کو ایک اور بال جسم پر سہناپڑ گئی اور کافی درد میں مبتلا کر گئی۔ اللہ اللہ کر کے اوور ختم ہوا۔ دوسری طرف محسن کمال صاحب بال تھامے تیار تھے۔ ان کو باؤلنگ اینڈ تبدیل کروانے کے لیے خالد نصیر خود سپِن باؤلنگ کرانے کے لیے آ گئے۔ اس دوران ضمیر الاحسن اور طارق بٹ صاحب نے مڈل آف دی پچ میٹنگ کی اور فیصلہ یہ ہوا کہ ضمیر صاحب فاسٹ باؤلنگ کی بجائے سپِن باؤلنگ کھیلیں گے اور بٹ صاحب تیز باؤلنگ۔ چنانچہ پہلی ہی بال پر طارق بٹ صاحب سنگل سکور کر کے نان اسٹرائیکنگ اینڈ پر آ گئے۔ خالد نصیر کا بقیہ اوور کھیلنے کے لیے ضمیر صاحب اسٹرائیکنگ اینڈ پر آ گئے۔ لیکن جیسے ہی خالد نصیر صاحب نے اپنے اوور کی دوسری گیند پھینکی تو ضمیر صاحب فارورڈ آئے اور ایک آسان سا کیچ فیلڈر کے ہاتھ میں تھما کر آؤٹ ہو گئے۔ اب ٹو ڈاؤن پوزیشن پر آصف کریم صاحب تشریف لے آئے۔ انھوں نے خالد نصیر کا اوور انتہائی احتیاط کے ساتھ کھیلا اور آخری گیند پر ایک رن بنالیا۔ اگلا اوور پھر محسن کمال صاحب نے شروع کر دیا۔ وکٹ کیپر کی غلطی سے بال، بائی کے ایک رن کے لیے تھرڈ مین پوزیشن کی طرف گئی۔ اور بیٹنگ کریز پر دوبارہ طارق بٹ صاحب آ گئے۔ اب کی بار محسن کمال صاحب نے اپنا سارا فن، کاریگری اور رفتار کو بروئے

کارلاتے ہوئے بال کو کبھی بٹ صاحب کے دائیں شانے، کبھی بائیں شانے اور کبھی سر کے اوپر سے غرض یہ کہ سوائے بٹ صاحب کو ڈرانے اور مزید خوفزدہ کرنے کے کوئی دوسرا کام کرنے کا نہیں سوچا۔ بٹ صاحب آخر بٹ صاحب تھے، شوں شوں کرتی بال جو دائیں بائیں سے گزر رہی تھی اس کو بیٹ کے ساتھ روکنے کی بہت کوششیں کیں لیکن کامیابی ندارد۔ اب تو بال باقاعدہ جسم کے ساتھ ٹکرانے کے موڈ میں تھی۔ چنانچہ بٹ صاحب کو چوٹوں پہ چوٹیں آنا شروع ہو گئیں۔ تقریباً یہ عمل دو ایک اوور اور چلا یہاں تک کہ بٹ صاحب کا حوصلہ جواب دے گیا۔ رہی سہی کسر یہ کہ بال جسم کے ساتھ زور زور سے ٹکرایا اور درد و تکلیف میں مبتلا کر گیا اور بٹ صاحب سخت بھنا گئے۔ اسی دوران ایک اندرونی کنارہ بال کے ساتھ لگا اور وکٹ کیپر نے بال دبوچ کر آسمان کی طرف اچھالا جو اس بات کا مظہر تھا کہ بٹ صاحب کی باری مکمل ہو گئی ہے اور بٹ صاحب کو واپس پویلین میں جانا ہے۔

اب طارق محمود بٹ صاحب خوفناک باؤلنگ سے کچھ بچتے، کچھ ڈرتے، سہتے اور شاید آٹھ دس سکور کر کے واپس پویلین پہنچے تو سخت تیوریاں چڑھیں، رنگ جو سرخ و سفید تھا پیلا ہوا۔ منہ خشک، سانس پھولا ہوا۔ آتے ہی ایک دستانہ اِدھر پھینکا دوسرا اُدھر۔ بلّا یہ جا وہ جا اور شدید ترین غصہ کی حالت میں ایک دو خالص لاہوری انداز کی گالیاں سناتے ہوئے سیدھا میری طرف آئے، بولے: "او قریشی، عباس قریشی یہ پریکٹس میچ ہے یا دہشت میچ؟ پریکٹس میچ ایسے ہوتے ہیں؟" یقین کریں بٹ صاحب کے اس ایک جملے نے پوری ٹیم کی پژمردہ

صورتِ احوال کو یک لخت متبسّم کر دیا اور ہر ایک بٹ صاحب کے اس جملے پر جھوم جھوم گیا۔ بٹ صاحب نے جب سب کو ہنستے دیکھا تو خود بھی ڈھیلے پڑ گئے اور تھوڑا سا مسکرائے اور بعد میں چند ایک چٹکلے سنائے۔ فاسٹ باؤلرز کے بعد رہی سہی کسر خالد نصیر صاحب کی سپِن باؤلنگ نے نکال دی۔ کلب والے بھی سمجھ گئے کہ ان کا مقابلہ یتیم مسکین قسم کی ٹیم سے ہے اس لیے وہ بھی شغل میلے میں لگ گئے۔ میں اور آصف کریم کچھ دیر ٹکے اور پوری ٹیم سو سے بھی کم اسکور پر آؤٹ ہو گئی۔ وحدت ایگلٹس والوں نے آٹھ یا دس اوورز میں سکور پورا کیا اور یوں ہم ایک پریکٹس میچ جو کہ دہشت میچ ثابت ہوا، بری طرح ہار گئے۔

اس میچ کا فائدہ یہ ہوا کہ ہماری ٹیم انٹر ڈیپارٹمنٹ کرکٹ ٹورنامنٹ کے سیمی فائنل تک آسانی سے پہنچ گئی لیکن چند وجوہات سے باقی ماندہ ٹورنامنٹ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔

## عبد القادر کی ٹیم سے میچ

عبد القادر مشہور و معروف رائٹ آرم لیگ سپنر اور گگلی باؤلر دھرم پورہ جم خانہ کی طرف سے کھیلتے تھے۔ نہایت گورے چٹے اور مناسب قد کاٹھ کے، اصلی پختون تھے اور میرے دوست شہزاد احمد خان کے گھر کے ساتھ ہی ان کا گھر تھا۔ ان کے ساتھ لیگ کرکٹ میں اکثر میچ ہوتے تھے۔ عبد القادر سیمنٹ کی وکٹ پر بھی اپنی جادوگر باؤلنگ کروانے میں ماہر تھے۔ ایک دفعہ وحدت ایگلٹس اور دھرم پورہ جم خانہ کا میچ وحدت کالونی کی گراؤنڈ میں کھیلا جا رہا تھا۔ غالباً اپریل کا

مہینہ تھا۔ میں نیا بال کر رہا تھا۔ میرا کپتان بلال بہترین کپتان اور کھلاڑی تھا۔ سیمنٹ وکٹ پر مجھے بہت مار پڑتی تھی لیکن وہ پھر بھی مجھ پر اعتماد بہت کرتا تھا۔ مجال ہے جو اس کے ماتھے پر کوئی بل آتا یا مجھے سست کہتا، ہر وقت حوصلہ بڑھاتا اور آخر میں مجھ سے آؤٹ بھی کروالیتا۔ بہرحال یہ تو ضمنی بات تھی جو ذہن میں آگئی، بات ہو رہی تھی عبدالقادر کی۔ میں نے نیا بال کروایا اور ایک دو اوپر والی وکٹیں بھی حاصل کرلیں۔ پھر عبدالقادر (مرحوم) آئے اور آتے ہی مجھے سیدھے چھکے مارنے شروع کر دیے۔ گیند بار بار وحدت روڈ پر جا کر گرے۔ میرے ساتھی لڑکے خوب انجوائے کریں کہ ایک سپنر سے مار کھا رہا ہے۔ بعد میں جب عبدالقادر نے لاہور میں 1987 کے ورلڈ کپ میں کورٹنی واش کو چھکا لگایا اور بھی کئی میچوں میں چھکے لگائے اور پاکستان کو میچ جتوائے تو تمام کرکٹرز کو علم ہو گیا کہ عبدالقادر ضرورت کے وقت چھکے اور چوکے بھی لگالیتا ہے۔

ہم یہ میچ اپنے ہی گراؤنڈ میں ہار گئے۔ وجہ عبدالقادر (مرحوم) کی لیگ سپن اور گگلی باؤلنگ تھی۔ سیمنٹ کی پچ پر بھی عبدالقادر مرحوم لمبی لمبی بریک اور دوسری ورائٹی استعمال کر رہے تھے جو ہمارے کسی بھی بلے باز کے لیے آسان نہ تھیں۔ اس میچ میں ہم عبدالقادر (مرحوم) کی جادوگر سپِن باؤلنگ کے دلدادہ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے مرحوم کو بہترین آرٹ سے نوازا تھا۔

## نذیر جونیئر کے ساتھ میچ

محمد نذیر عرف نذیر جونیئر پاکستان کے نامور آف سپنر رہے ہیں۔ فرسٹ

کلاس میچ میں ان کے کئی ریکارڈ ہیں۔ بڑا عرصہ پہلے 1969 کو نیوزی لینڈ کے خلاف ٹیسٹ کرکٹ کھیلی اور بعد میں ٹیم میں جگہ نہ بنا سکے۔ پھر کافی سال کے بعد دوبارہ ٹیم میں واپس آئے اور ویسٹ انڈیز، آسٹریلیا اور بھارت کے ساتھ ٹیسٹ اور ون ڈے کھیلے۔ نذیر جونیئر کو ٹی وی میں ڈھیلا ڈھالا انداز اپنائے اور لمبی لمبی باؤلنگ کرتے دیکھتے تھے تو یہی گمان ہوتا تھا کہ نذیر صرف ایک روایتی آف سپنر ہے جو ایک ہی سٹائل سے سیدھی بال پھینکنے کا عادی ہے لیکن میرا یہ نظریہ بالکل غلط ثابت ہو گیا۔ جب وحدت ایگلٹس کی گراؤنڈ میں نذیر جونیئر سے جو کسی ٹیم کی طرف سے کھیلنے کے لیے آئے تھے، سامنا ہوا۔ ہمارے بلے باز روایتی انداز میں کھیلنے کے عادی تھے یعنی فارورڈ آتے اور بال کو روکتے یا بیک فٹ پر لیگ سائیڈ پر کھیلتے۔ لیکن ہو یہ رہا تھا کہ نذیر جونیئر نے باقاعدہ ایک سلپ اور سلی مڈ اون فیلڈر لیے ہوئے تھے۔ بلے باز (سیدھے ہاتھ والا) فارورڈ جائے تو بال آف سائیڈ پر نکل جائے اور باقاعدہ ٹپہ کھا کر یا تو سیدھی رہے یا لیگ سپِن ہو جائے۔ کئی بلے باز آگے بڑھ کر چھکا لگانے کے چکر میں سٹمپ آؤٹ ہو گئے۔ اس وقت قطعاً اندازہ نہیں ہوا کہ ایک آف سپنر جس کی بال دائیں ہاتھ سے کھیلنے والے بلے باز کو آف سٹمپ سے ٹپہ کھانے کے بعد اندر آنی چاہیے وہ آف سے باہر کیوں جا رہی ہے۔ ہمارے سارے بلے باز یہی کہیں کہ یہ بھی ایک ورائٹی ہے جو نذیر جونیئر کرتے ہیں۔ بہر حال یہ ایک مِسٹری باؤلنگ تھی جو فنکارانہ انداز میں ہو رہی تھی۔ ہم میچ ہار گئے لیکن نذیر جونیئر صاحب کی پراسرار باؤلنگ کا تجزیہ کرتے رہے۔ وہ تو بعد

میں ویسٹ انڈیز کے ساتھ ملتان ٹیسٹ میں جب سر ویون رچرڈز نے نذیر جونیئر کو کھیلا اور بہت سٹپٹایا۔ کئی گیندیں اس کے پلے ہی نہ پڑیں، تو سمجھ آیا کیونکہ یہ ویسا ہی سین تھا جس کا سراغ ہم ڈھونڈتے رہے تھے۔ اس سے پہلے بھی مِسٹری باؤلنگ ہو رہی تھی لیکن منظرِ عام پر پہلی دفعہ آئی کہ دائیں ہاتھ سے کھیلنے والے بلے باز آف سپِن کو کھیلنے کے لیے فارورڈ جائے یا بیک فٹ تو بال بجائے اندر آنے کے آف سٹمپ سے باہر چلی جائے۔ اسی طرح بائیں ہاتھ سے کھیلنے والا بلے باز بال کو باہر جاتا سمجھے اور بال اندر آ جائے۔ بہر حال یہ نذیر جونیئر صاحب کی فنکارانہ صلاحیتیں ہی تھیں کہ ظہیر عباس جب پاکستان کی کرکٹ ٹیم کے کپتان بنے اور بھارت کا دورہ کیا تو اپنی ٹیم میں نذیر جونیئر کو ضرور شامل کیا۔ وہاں بھی نذیر جونیئر نے اپنی آف سپِن اور مِسٹری ورائٹی سے کافی نام کمایا۔ بعد میں آنے والے آف سپنرز جو پاکستان کی طرف سے کھیلے مثلاً اکرم رضا، اعجاز فقیہہ، توصیف احمد اور حافظ سجاد اکبر وہ بھی اس ورائٹی سے آگاہ تھے اور بلے بازوں کو اچھا خاصا تنگ کرتے تھے۔

## "دوسرا" کی دریافت (ایک ذاتی موقف)

ثقلین مشتاق آف سپنر کا پاکستان کرکٹ ٹیم میں تعارف اور شمولیت ایک بہت بڑا انقلاب سمجھا جاتا ہے۔ خاص طور پر "دوسرا" باؤلنگ ورائٹی (سیدھے ہاتھ سے کھیلنے والے بلے باز کو آف سپِن کا بال بجائے اندر آنے کے باہر جانا اور بائیں ہاتھ کے بلے باز کو بال باہر جانے کے بجائے اندر آنا)۔ یہ وہی ورائٹی ہے جو

میں نے پہلے ذکر کیا کہ نذیر جونیئر اور اس کے بعد آنے والے تقریباً تمام آف اسپنرز خاص طور پر جو پاکستان کے لیے کھیلے، بشمول توصیف احمد، جانتے اور اس کا استعمال بھی کرتے تھے۔ لیکن چونکہ ثقلین مشتاق کا زمانہ ماڈرن کرکٹ کا زمانہ کہلایا جا سکتا ہے اور جس میں کیمرہ ٹیکنالوجی، ایکشن ری پلے، ہاتھوں کا بال کے ساتھ استعمال اور بلے بازوں کی مختلف شارٹس اتنی نزدیک اور باریک بینی سے بنائی اور دکھائی جا رہی ہیں اور ساتھ ساتھ تجربات جو نئے اور پرانے کھلاڑی کرتے ہیں اس وجہ سے یہ بال جسے پہلے مِسٹری بال کہتے تھے، وہ مشہور ہو گئی "دوسرا"۔ "دوسرا" کا لفظ حقیقی معنوں میں وسیم اکرم اور وکٹ کیپر معین خان کی وجہ سے مشہور ہوا کیونکہ مائیک میں اکثر ان دونوں کی آواز آتی کہ ثقلین "دوسرا" کرو۔

"دوسرا" بال ثقلین مشتاق نے خوب استعمال کیا اور خاص کر ورلڈ کرکٹ سیریز جو آسٹریلیا میں کئی سال تک کھیلی جاتی رہی ہے، وہاں پر ویسٹ انڈیز اور آسٹریلیا کے بلے بازوں کو خوب خوب پریشان کیے رکھا۔

مل جل کر اگر میں یہ کہوں کہ "دوسرا" صریحاً اور اصلاً پاکستانی گیند بازوں کی ایجاد اور مہارت ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ کیونکہ انھی دنوں کی بات ہے جب دوسرے ملکوں کے ورلڈ کلاس آف سپنر جیسے آسٹریلیا کے بروس یارڈلے یا انڈیا کے پرسنا اور ویسٹ انڈیز کے لانس گبز وغیرہ لیکن یہ سب تقریباً ایک ہی لائن اور لینتھ میں بال کر کے بلے باز کو باندھ رکھتے تھے۔

سری لنکا کے مرلی دھرن کے بارے میں بہت مشہور کیا گیا کہ "دوسرا"

بال کا موجد مرلی دھرن ہے لیکن میں چونکہ 1969 سے کرکٹ کے ساتھ دل چسپی رکھتا ہوں، اس لیے میری یادداشت کے مطابق ”دوسرا“ بال مرلی دھرن کے آنے سے کافی پہلے متعارف ہو چکا تھا۔ بے شک اس ”دوسرا“ بال کا بہترین استعمال مرلی دھرن نے کیا لیکن اس کی ابتدا جناب محمد نذیر (نذیر جونیئر) کر چکے تھے جسے بعد میں آنے والے پاکستانی آف سپنرز نے خوب نکھارا اور پروان چڑھایا۔ باقی انڈیا کے موجودہ آف سپنر روی چندرن ایشون، ہر بھجن سنگھ اور پاکستان ہی کے سعید اجمل نے اس بال کو چار چاند لگا دیے۔

## جنونِ کرکٹ کو جھٹکا

یہ غالباً 83-1982 کا کرکٹ سیزن تھا جب انٹر کالجیٹ کرکٹ ٹورنامنٹ کا آغاز ہونا تھا اور میری ٹرم بحیثیت پنجاب یونیورسٹی ٹیچنگ ڈیپارٹمنٹ کرکٹ ٹیم کے کپتان کے طور پر آ گئی۔ ہماری کرکٹ ٹیم بظاہر بہت مضبوط تھی کیونکہ اس میں کیمیکل ٹیکنالوجی کے ساڑھے چھ فٹ لمبے قد کے بہترین سوئنگ باؤلر آغا ارسلان اور حماد خان ایم بی اے سے معروف کرکٹر، اور بعد میں پاکستان کرکٹ ٹیم کے کپتان جناب رمیز حسن راجا، بہترین رائیٹ آرم لیگ سپنر ناصر عباس اور انجم خان۔ اور سب سے اہم بات میرے چھوٹے بھائی عبدالرزاق قریشی صاحب جو بہترین کرکٹر تھے، کی شمولیت تھی۔ عبدالرزاق قریشی بہت اعلیٰ بلے باز تھے اور پنجاب یونیورسٹی سپورٹس بورڈ کی درخواست پر یونیورسٹی ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے کھیلنے کے لیے تیار ہوئے تھے۔ ہمارا پہلا میچ جولا کالج کے ساتھ تھا اس

میں بھی میرے دوست نصرت (سونی) مرحوم تھے اور اس کے علاوہ ماڈل ٹاؤن کرکٹ کلب کے بہت اچھے اچھے کھلاڑی تھے۔

ٹاس ہم لوگ جیت گئے اور رمیز راجہ کے ساتھ عبدالرزاق قریشی کو اوپنر بھیجا۔ میرے بھائی عبدالرزاق قریشی بھی چھ فٹ سے زیادہ ہائیٹ رکھنے والے مضبوط جسم کے مالک اور بہترین اوپنر تھے، لہٰذا امید یہی تھی کہ ایک دو اوورز کے بعد رمیز راجہ اور عبدالرزاق خوب ہاتھ کھولیں گے اور اس میچ کو ہم لوگ بآسانی جیت جائیں گے۔ اس میچ کے بعد والے میچ سہ روزہ قرار پائے تھے اس لیے اپنی طرف سے یہی پلاننگ تھی کہ عبدالرزاق قریشی کو اس میچ کے بعد اور میچ بھی ملیں گے اور یونیورسٹی انتظامیہ کی مکمل پلاننگ تھی کہ عبدالرزاق قریشی کو کیمیکل انجینئرنگ میں داخلہ دیا جائے گا۔ لہٰذا میں اور بھائی عبدالرزاق قریشی کے علاوہ جو بھی عبدالرزاق قریشی کی کرکٹ سے واقف تھے سب ہی پُر امید تھے کہ کرکٹ کے ایک بہترین آل راؤنڈر کا آغاز ہو رہا ہے اور تقریباً سارے ہی جاننے والے جس میں مسلم ٹاؤن، وحدت کالونی اور ہمارے اپنے کلب کے لوگ تھے، وہ عبدالرزاق قریشی کی کرکٹ دیکھنے کے لیے اولڈ کیمپس کی تاریخی گراؤنڈ میں تماشائی کی حیثیت سے موجود تھے لیکن بقول مرزا رضا برقؔ:

اے صنم وصل کی تدبیروں سے کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

کے مصداق پہلے اوور کی پہلی ہی گیند آف سائڈ آف سٹمپ پر بہترین جگہ پر لینڈ

ہوئی اور عبدالرزاق قریشی نے اس کو ڈرائیو کیا۔ بال سیدھا ڈیپ کور پر کھڑے فیلڈر کے ہاتھوں میں بالکل باؤنڈری لائن پر پہنچ گیا اور پورا تماشائیوں کا سٹینڈ سُن ہو گیا۔ جس فیلڈنگ پوزیشن پر عبدالرزاق قریشی کیچ آؤٹ ہوا، اس پوزیشن پر کبھی بھی نئی بال کرنے والے باؤلر نے فیلڈر نہیں لیا اور عبدالرزاق قریشی کے ہاتھوں نے بھی ذرا بال لیفٹ کرنے یعنی چھوڑنے کی کوشش نہیں کی کہ پہلا پہلا بال ہے ذرا سوئنگ اور وکٹ کا مزاج پرکھ میں آجاتا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ ساری مستقبل کی پلاننگ کا دارومدار اس میچ پر تھا اور ایک ہی بال نے ساری پلاننگ کو لپیٹ دیا۔ میں خود دم بخود رہ گیا کیونکہ اگلے جتنے بھی مراحل تھے اس کا نقطۂ آغاز کوئی اچھا نہیں ہوا۔ بہرحال امید کے سہارے دنیا قائم ہے، رمیز حسن راجہ کی سنچری کی بدولت ہم نے اچھا خاصا ٹارگٹ حاصل کر لیا اور جب لا کالج کی بیٹنگ آئی تو کمال مہارت سے ان کے پہلے پانچ یا چھ بہترین بلے باز آؤٹ بھی کر لیے۔ عبدالرزاق نے سلپ پوزیشن میں اچھے کیچ لیے اور آغا ارسلان نے بھی بہترین باؤلنگ کی۔ امید کی کرنیں ایک دفعہ پھر روشن ہو گئیں کہ جلد ہی لا کالج کے باقی ماندہ بلے باز بھی آؤٹ ہو جائیں گے اور ہم فتح یاب ہوں گے۔ لا کالج کے ایک آل راؤنڈر تھے، پورا نام تو اس وقت ذہن میں نہیں لیکن ان کو ہولڈر کے نام سے جانا جاتا تھا۔ تو ہوا یوں کہ لیگ سپنر ناصر عباس نے بہترین باؤلنگ کی۔ ہولڈر کے کیچ نکلنا شروع ہوئے لیکن ہمارے بیٹنگ ہیرو جناب رمیز حسن راجہ نے کیچ چھوڑنے شروع کر دیے۔ ادھر ہولڈر کی آنکھ ٹک گئی اور اس نے آہستہ آہستہ باؤنڈریز لگانا

شروع کر دیں۔ ناصر عباس کی بال پر بالکل آسان کیچ ایک بار پھر راجہ صاحب نے ڈراپ کیا اور ہم بے بسی کی تصویر بنے دیکھتے رہے۔ کرتے کرتے ٹارگٹ کے نزدیک نزدیک لا کالج کے دس بلے باز آؤٹ ہو گئے تو علم ہوا کہ میچ گیارہ کے بجائے 12 کھلاڑیوں نے کھیلنا ہے اس لیے لاسٹ بلے باز نے بارہویں نمبر پر آکر کریز سنبھال لی۔ چند ایک رنز رہتے تھے کہ تھرڈ مین پوزیشن پر کھڑے احسن نے کیچ گرا دیا اور پنجاب یونیورسٹی ٹیچنگ ڈیپارٹمنٹ کی ٹیم لا کالج سے ہار گئی۔ اس ہار نے بے حد بد دل کر دیا۔ زیادہ بد دلی یہ تھی کہ بھائی عبدالرزاق قریشی کا مستقبل بحیثیت کرکٹر بری طرح دھندلا گیا۔ یہ میری کرکٹ کی زندگی کا انتہائی افسوسناک اور مایوسی والا دن تھا۔ میں بہت شکستہ دل ہو گیا کیونکہ اگلا سال میرا یونیورسٹی کا آخری سال تھا اور میری دلی خواہش تھی کہ بھائی عبدالرزاق قریشی پنجاب یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرے اور ساتھ ساتھ کرکٹ بھی کھیلے۔ یہ بات نہ صرف میں بلکہ اس زمانے کے تقریباً تمام کرکٹ کے پنڈت مانتے تھے ہ بھائی عبدالرزاق کو صرف ایک میچ چاہیے جس میں وہ پرفارم کرے اور پاکستان کو کرکٹ کے میدان میں ایک اور نا،مور کھلاڑی دستیاب ہو جائے گا۔ لیکن قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے۔ عبدالرزاق قریشی کو اپنی ذہانت کی بنا پر کراچی یونیورسٹی میں ریاضی کے مضمون میں داخلہ مل گیا اور بڑے بھائی کمانڈر محمد اویس قریشی صاحب کے پاس رہنے لگے۔ لائق اور ذہین تو تھے ہی اس لیے کراچی یونیورسٹی سے ریاضی میں ٹاپ کیا اور گولڈ میڈل کے حق دار ہوئے۔

باب چہارم

# خواب و تعبیر

میرا بچپن ساٹھ اور ستر کی دہائیوں میں اپنے عروج پر تھا اور ان دہائیوں میں امن و امان کی صورتِ احوال بہت حد تک بہتر تھی۔ لوگ زیادہ تر اگر خوشحال نہ تھے تو یقیناً بدحال بھی نہ تھے۔ کھانے پینے اور روزمرہ کے اخراجات تقریباً ہر بندے کی استطاعت اور پہنچ میں تھے۔ شہروں میں آبادی کا بے ہنگم شور شرابہ نہ تھا۔ گاؤں اپنی اصل صورت میں موجود تھے، اسی طرح شہری اور دیہی زندگی میں علیحدہ علیحدہ رنگ نمایاں تھا۔ لوگوں کی حرکات و سکنات، گفتگو کے طرزِ عمل، ذہنی پختگی اور ناپختگی واضح طور پر ان کے علاقوں پر گواہ تھیں۔ بس یہ سمجھ لیں کہ ذرائع ابلاغ محدود تھے۔ موبائل کی ایجاد اور اس کا عمل دخل روزمرہ زندگی کی پاکیزگی کو پولوشن میں ابھی ڈھال نہ سکا تھا۔ لوگ ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے حالات حاضرہ سے آگہی حاصل کرتے تھے۔ خوشی و غمی بھرپور انداز میں اور اصل روح پرور طریقے سے منائی جاتی تھیں۔ اسی طرح

ہماری روایتی کھیلیں؛ پہلوانی، کبڈی، ہاکی، گلی ڈنڈا، کانچ کی بنی ہوئی گولیاں جن کو عرف عام میں کنچے یا پل گولی کہا جاتا تھا، بھرپور طریقے سے کھیلی جاتی تھیں۔ پتنگ بازی کا کھیل اپنے عروج پر تھا خاص طور پر بسنت کے دنوں میں جو کہ فروری کا پہلا یا دوسرا ہفتہ قرار پاتا تھا۔ لاہور کا آسمان نت نئے دیدہ زیب رنگوں کی پتنگوں سے اَٹ جاتا بلکہ نیلا آسمانی رنگ غائب ہو جاتا اور ہر طرف آسمان پر اُڑتی نت نئے ڈیزائن کی پتنگوں کا راج ہوتا۔ آسمان پر تو پتنگوں کا گھمسان کا رن پڑتا لیکن زمین پر لڑکے بالوں اور کبھی کبھار اچھے بھلے آدمیوں کی ٹولیاں ہاتھوں میں بڑے بڑے لمبے بانس نما ہتھیاروں سے کٹی پتنگوں کا شکار کرتے نظر آتے۔ 'بوکاٹا'، 'وہ مارا' سارا دن ان الفاظ اور جملوں کا راج رہتا۔ پتنگ بازی ایسا نادر آرٹ تھا جس میں بہت سارے مکاتیبِ فکر اور وابستگیِ روزگار کے حامل لوگ حصہ لیتے اور لطف اندوز ہوتے۔ مرد تو مرد خواتین بھی بسنت کے تہوار کو خصوصی طور پر مناتیں اور طرح طرح کے کھانے اور دعوتوں کا اہتمام کرتیں۔ غرض یہ کہ پتنگ بازی کا شوق، کھیل اور جنون اس حد تک بڑھا ہوتا تھا کہ بعض اوقات اس کے نقصانات کی تفصیل اس کے وقتی لطف سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی اور بعدازاں نقصانات خاص طور پر طالب علموں کے لیے خاصی زہرِ قاتل ثابت ہوتی۔ فروری کے مہینے کے آخر میں یا مارچ کے شروع میں سکولوں میں سالانہ امتحانات بھی منعقد ہوتے اور سالانہ امتحانات کی تیاری میں یہ بسنت میلہ کافی منفی ثابت ہوتا۔

## پتنگ بازی سے توبہ

میں نے بھی اپنا بچپن انتہائی کھلنڈرے پن میں گزارا۔ اور بچوں کی طرح مجھے بھی پتنگ بازی سے بہت شغف رہا لیکن ایک بات کا اہتمام کرتا کہ بجائے سڑکوں یا پارکوں میں کٹی ہوئی پتنگوں کو لوٹنے کے اپنے گھر کی چھت پر بیٹھ جاتا اور کسی کٹی پتنگ کا انتظار کرتا اور اگر کوئی کٹی پتنگ قابو چڑھتی تو اس کا شکار کر لیتا۔ لیکن یہ شغف بے حد انتظار طلب اور موجبِ ضیاعِ وقت تھا۔ پڑھائی یقیناً متاثر ہوتی اور اس کا اثر سکول میں ہوتے امتحانات کے نتائج پر پڑتا۔ والد محترم (اللہ غریقِ رحمت کرے) بے حد محبت کرنے والے تھے لیکن پڑھائی کے معاملے میں کسی قسم کی رعایت دینے کے حق میں نہ تھے۔ کچھ دنوں سے یوں ہو رہا تھا کہ وہ دفتر سے چھٹی پر جب گھر آتے تو مجھے چھت سے نیچے اترتا ہوا دیکھتے اور ناراضگی کا اظہار کرتے۔ ایک دو دفعہ غصے میں ڈانٹا بھی لیکن میں اپنی عادت سے باز نہ آیا اور نتیجتاً میں الجبرا کے امتحان میں فیل ہو گیا۔ والد صاحب بے حد ناراض ہوئے اور مجھے کافی سخت باتیں سنائیں۔ بہر حال میرے پہلے خواب کا ذکر یہاں پر اس لیے ہو رہا ہے کہ اس خواب کا نتیجہ میری آنے والی زندگی پر بہت زیادہ پُر اثر ہے۔

خواب کچھ یوں تھا کہ میں حسبِ معمول اپنے گھر کی چھت پر بیٹھا مغرب کی طرف رخ کر کے کٹی پتنگوں کے شکار کے لیے انتظار کر رہا ہوں اور انتظار کافی طویل ہو گیا ہے لیکن کوئی کٹی پتنگ ہماری چھت پہ نہیں آئی اور اسی اثناء میں عصر کا وقت ڈھل گیا اور مغرب کی شام عود آئی کہ یکا یک والدِ محترم کا چہرہ نظر آیا جو

کہ اپنے قد کاٹھ سے کہیں زیادہ تھا۔ تقریباً ایسے لگا کہ والد صاحب گھر کے صحن میں کھڑے ہیں اور ان کا قد بڑھتے بڑھتے چھت تک آ گیا ہے۔ والد صاحب کے چہرے پہ انتہائی غصے کے آثار ہیں اور وہ مجھے دیکھ رہے ہیں اور میرا حال یہ ہے کہ سانس بند ہوتی محسوس ہو رہی ہے اور شرمندگی کی وجہ سے میں ان کا سامنا نہیں کر پا رہا۔ گلا خشک ہو گیا اور ساتھ ہی میری آنکھ بھی کھل گئی۔ جب آنکھ کھلی تو بے حد ڈرا ہوا ماحول تھا۔ مجھے خواب میں سب کچھ سچ لگ رہا تھا اور تقریباً ایسے ہی تھا کہ جیسے والد صاحب ابھی چھینٹا لگائیں گے۔ لیکن طبعی چھینٹی اس روحانی ڈر اور خوف کی کیفیت سے زیادہ مشکل نہ ہوتی لیکن یہاں تو یہ حال ہوا کہ جسم کے سارے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور والد صاحب کا چہرہ مبارک میرے لیے ایک ڈراؤنا اور ہیبت ناک منظر پیش کر گیا۔

اس خواب کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگلے دن جب چھت پر جانے کا خیال آیا تو رات والے خواب کو ذہن میں پایا۔ ایک جھرجھری سی آ گئی اور چھت پر جانے کا ارادہ فوراً ذہن سے جھٹک دیا۔ اسی طرح کئی دن گزر گئے اور چھت پر جانا تقریباً موقوف ہو گیا۔ پتنگ بازی ہوتی رہی لیکن میں چھت پر نہ گیا اور سکول کی پڑھائی میں مشغول ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے یوں مجھے اس قبیح عادت سے نکالا اور میں اپنی پڑھائی کی طرف مرتکز ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے صفت کے مطابق وہ راستہ جو میرے لیے انتہائی مضر تھا میرے والد صاحب کی ڈراؤنی اور خوف زدہ شکل دکھا کر بدل دیا اور میں سیدھے راستہ پر آ گیا ورنہ کیا معلوم کس راستہ پر دھکے کھاتا۔

## ڈاکٹری سے جیالوجی

اسی دوران وقت کا پہیہ آہستہ آہستہ چلتا رہا اور دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلتے رہے۔ 1975 میں میرا میٹرک کا رزلٹ آگیا جو اس زمانے کے اعتبار سے بہت شاندار ہی نہ تھا بلکہ میری فیملی میں ریکارڈ ساز بھی تھا۔ سارے خاندان میں خوب واہ واہ ہوئی اور میں مارے خوشی کے پھولا نہ سماؤں۔ اب تو ہر طرف میری شاندار کامیابی کی باتیں ہو رہی تھیں اور جو لڑکے بالے مجھ سے چھوٹے تھے ان کو میری مثالیں دے کر ان کے والدین ان کو بھی ایسی ہی کامیابی حاصل کرنے کے لیے اُکسا رہے تھے۔ اور تو اور میرے مستقبل کے بارے میں فیصلہ بھی ہو گیا کہ عباس کو ڈاکٹر بنانا ہے اور انٹر میڈیٹ میں ایف ایس سی مضامین بشمول بیالوجی کے مضمون رکھوائے گئے۔ میں بھی میٹرک کی کامیابی کو ابدی کامیابی سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو ڈاکٹر بنتا محسوس کر رہا تھا۔ گورنمنٹ کالج آف سائنس وحدت روڈ میں پری میڈیکل مضامین کے ساتھ داخلہ ہوا اور روزِ اوّل سے ہی اپنے آپ کو میڈیکل کا سٹوڈنٹ سمجھنا شروع کر دیا۔ والد محترم نے جب ایف ایس سی کی کتابیں لا کر دیں تو بیالوجی کی موٹی تازی کتاب کو خاص طور پر دیکھا، کھولا، پرکھا اور اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا کہ اب یہی ساتھی ہے اور نشانی بھی۔ اور تو اور جب Dissection Box دیکھا تو اپنے آپ کو سرجن سمجھنا شروع کر دیا۔ اور پھر جس دن مینڈک کا آپریشن کیا تو پھر کچھ نہ پوچھیں، اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا لفظ شامل کر لیا۔ ایک

دن تو یہ ہوا کہ ہماری ایک مرغی بیمار ہو گئی اور اس کو لہسن کھلا دیا کہ دیکھنا یہ ٹھیک ہو جائے گی۔ اب یہ یاد نہیں کہ وہ ٹھیک ہوئی یا نہیں لیکن مجھے ڈاکٹری کا جو بخار چڑھا تو چڑھتا ہی گیا، جب تک یہ خواب نہ آیا جو میں بیان کر رہا ہوں۔ یہ خواب عین ان دنوں آیا جب میں ایف ایس سی کے امتحانات دے کر فارغ ہوا اور نتیجہ کا انتظار کر رہا تھا۔ خواب کچھ یوں تھا کہ؛

میں ایک ٹرین میں سفر کر رہا ہوں اور سفر بے حد آرام دہ ہے۔ میری نشست کھڑکی کے ساتھ ہے اور باہر کے مناظر انتہائی دل فریب اور خوش کن ہیں۔ ٹرین مختلف سٹیشنوں پر رکتی اور پھر چلتی ہے۔ مسافر اترتے اور چڑھتے ہیں اور سب کچھ بالکل نارمل ہے۔ اب یہ بات معمہ ہے کہ اس وقت تک مجھے نہیں یاد کہ میں نے کوئی ٹرین کا سفر کیا ہو یا مجھے ریلوے اسٹیشن، جنکشن یا اس سے متعلقہ باتوں کا علم ہو۔ اب ٹرین تو بظاہر لوہے کی پٹڑی پر ہی چلتی ہے کیونکہ اس کا نظام بھی یہی ہے کہ ٹرین کی بوگیوں کے لوہے کے پہیے ریلوے کی لوہے کی پٹڑی پر فٹ آ کر چلتے ہیں لیکن ہوا یہ کہ خواب میں جس ٹرین میں مَیں بیٹھا سفر کر رہا ہوں یکایک وہ ریلوے پٹڑی کو چھوڑ دیتی ہے اور سڑک کے اوپر چلنا شروع کر دیتی ہے۔ ٹرین کی رفتار جو پٹڑی پہ چلتے ہوئے کچھ اور ہوتی ہے وہ کسی بس یا ویگن کی طرح باآسانی قابو میں آنے والی بن جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ چھوٹی چھوٹی سڑکوں اور راستوں پر ایسے دوڑتی ہے جیسے کوئی عام چار پہیوں والی گاڑی۔ اب خواب ہی کی حالت میں مَیں چونکنے والی پوزیشن میں آتا ہوں اور حیران ہوں کہ

یہ ٹرین اپنی مخصوص حالتِ روانگی کو چھوڑ کر عام سڑکوں پر عام گاڑیوں کی طرح رفتار کے زیر و بم کے ساتھ رواں دواں ہے جو کہ بالکل ایک انہونی سی بات ہے اور نا قابلِ یقین بھی۔ اسی دوران آنکھ کھل گئی اور خواب کی یادداشت تازہ بہ تازہ ہونے کی وجہ سے طبیعت پر ابھی تک اثر انداز تھی۔ بہرحال آنکھ کھل گئی اور جو یقین محکم اپنے ڈاکٹر بننے کا کافی عرصہ سے طاری تھا وہ کسی حد تک ڈانواں ڈول ہو گیا کیونکہ خواب ایک پیچیدہ سی صورت احوال کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ایک معمول سے ہٹ کر غیر معمولی عمل کسی اور طرف اشارہ کر رہا تھا۔ یہ سوچ کر میں کافی پریشان ہوا کہ میر اراستہ خواب میں بدلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ تھوڑا سا غور کیا تو ایسے لگا جیسے میر اراستہ بدل دیا گیا ہو اور جو میں سوچ رہا ہوں شاید وہ مستقبل میر انہ ہو یعنی ڈاکٹری شاید قسمت میں نہ ہو اور اللہ تعالیٰ نے کسی اور راستہ اور منزل کا تعین کیا ہو۔ بہرحال کچھ دنوں تک اس خواب کا اثر اور کیفیت طبیعت کی پژمردگی کا سبب بنی رہی اور طبیعت میں ایک بوجھل پن سا محسوس ہوتا رہا۔ تقریباً دو سال سے جو ذہن بنا ہوا تھا وہ نہ صرف بکھرنا شروع ہو گیا بلکہ ایک انجان سا خوف بھی مسلط ہو گیا۔ اب یہاں اس بات کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گا کہ اس خواب کی تعبیر کی سچائی اور برحق ہونے میں مجھے کسی قسم کا شک و شبہ نہیں تھا۔ بعد میں ایک نیک بزرگ نے کسی محفل میں ذکر کیا کہ یوں تو بے شمار خوابوں سے واسطہ پڑتا ہے لیکن کوئی خواب ایسا بھی ہوتا ہے جو باقاعدہ اپنا اثر رکھتا ہے اور معرضِ وجود میں آنے کو بے تاب و بے قرار رہتا ہے۔ چنانچہ میرے ساتھ بھی

ایسے ہی ہوا۔ جب انٹر میڈیٹ کا نتیجہ آیا اور مطلوبہ نمبر جو میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے ضروری تھے نہ آسکے تو خواب کی اہمیت کا اندازہ ہونا شروع ہو گیا۔ بہر حال میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے جو عمل درکار ہوتا ہے وہ مکمل کیا۔ داخلہ فارم پُر کر کے جمع کروایا اور ساتھ ہی پنجاب یونیورسٹی میں انسٹیٹیوٹ آف جیالوجی میں بھی داخلہ فارم جمع کروا دیا۔ اب اس خواب کی حقیقت سامنے آئی جب میڈیکل کالج میں داخلہ چند نمبروں کی کمی کی وجہ سے نہ ہو سکا اور پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ میرٹ پر ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے کمال مہربانی سے ایک سچے خواب کی وجہ سے ذہنی آسودگی عطا فرمائی اور میرے مستقبل کا تعین کر دیا۔

انسٹیٹیوٹ آف جیالوجی میں یوں تو پڑھائی کا سیشن چار سال پر محیط تھا لیکن اس دوران ملک میں جاری سیاسی معاملات بشمول جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب کی پھانسی اور کئی ایک پیپرز میں بائیکاٹ کی وجہ سے سیشن لمبا ہوتا گیا اور بالا آخر جون 1985 میں ایم ایس سی کے نتیجہ پر ختم ہوا۔

اس زمانے میں جیالوجی ایک شہرہ آفاق مضمون کے طور پر سامنے آچکا تھا اور اس کی افادیت کسی بھی ملک کی معیشت کے لیے ایک ریڑھ کی ہڈی کے طور پر سامنے آچکی تھی۔ خاص طور پر معدنیات کی دریافت جس میں تانبا، لوہا، سونا تو تھا ہی لیکن تیل و گیس کی دریافت اور استعمال اس کا آفاقی جز تھا۔

## ایک کلاسیفائیڈ ادارہ میں نوکری

جن دنوں ایم ایس سی جیالوجی کا دورانیہ چل رہا تھا اس دوران یا تو کئی

جیالوجی سے متعلقہ ادارے کام کر رہے تھے یا نئے نئے ادارے معرضِ وجود میں آ رہے تھے۔ ستر کی دہائی میں جو جیالوجی سے متعلقہ ادارے معرضِ وجود میں آئے ان میں او جی ڈی سی جیسے ادارے بشمول پنجاب منرلز ڈویلپمنٹ اور پاکستان منرلز ڈیویلپمنٹ بھی تھے اور ان کے خاطر خواہ فوائد بھی سامنے آ رہے تھے۔ ملک میں ان اداروں کی روز افزوں ترقی اور افادیت کے مباحثے بھی جاری تھے۔ اسی دوران واپڈا، ہائی وے اور پاکستان اٹامک انرجی کمیشن جیسے ادارے ترقی کی راہ پر فائز ہوتے ہوئے اپنے اندر سائنس اور انجینئرنگ کے لیے وسعت پیدا کر رہے تھے۔ ان اداروں میں جیالوجی جیسے مضامین میں ماہرین کی ایک اچھی خاصی تعداد جذب ہو رہی تھی اور ایک بہترین ترقی کے دور کا دروازہ کھل رہا تھا۔

مگر ان تمام اداروں کی سیلری کا سٹیٹس ایک جیسا نہ تھا اور شنید تھا کہ سب سے زیادہ معاشی صلہ اور دوسرے فوائد او جی ڈی سی ڈیپارٹمنٹ مہیا کرتا ہے اس لیے میں نے بھی او جی ڈی سی میں جانے کی نیت سے پٹرولیم سے متعلقہ مضامین اختیار کیے اور ذہن بنالیا کہ اگر کوئی فیلڈ چنی تو او ڈی جی سی میں ہی جاؤں گا۔

چنانچہ ایم ایس سی جیالوجی کے فائنل پیپرز کے بعد کچھ عرصہ فارغ رہے اور آئل اینڈ گیس کے متعلق اور دوسرے اداروں کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہتے، اسی دوران واپڈا اور او جی ڈی سی جیسے اداروں میں نوکریوں کے سلسلہ میں اخبارات کے ذریعے معلومات بھی حاصل ہوتی رہیں۔ بلکہ باقاعدہ درخواستیں بھی جمع کروادیں۔ ذہن زیادہ تر او جی ڈی سی کی طرف مائل تھا اور اس

لیے بھی کیونکہ ہر شخص او جی ڈی سی کی ہی باتیں کر رہا ہوتا تھا۔ جو دورانِ طالب علمی اچھے نمبر حاصل کر چکے تھے وہ ہائیڈرو کاربن یا بین الاقوامی ادارے جیسے شلمبر جر اور سعودی عرب یا یو اے ای میں معروف آئل کمپنیوں کی باتیں کرتے تھے۔ الغرض یہ بات ذہن میں اچھی طرح چپک گئی کہ اگر جاب کرنی ہے تو آئل اینڈ گیس سے متعلقہ اداروں میں چاہے وہ پاکستان میں ہو یا پھر بیرونِ ملک کیونکہ پیسے بہت ملتے ہیں۔ یہ ان دنوں کا خواب ہے جب ذہن پٹرولیم انڈسٹری کے خیال میں الجھا ہوا تھا اور میں خود کو ایک کامیاب و فعال ماہرِ ارضیات سمجھ رہا تھا۔ خواب کی تفصیل کچھ یوں ہے:

میں نمازِ فجر پڑھنے کے بعد اپنے گھر واقع رحمان پورہ لاہور کی چھت پر بچھی ایک چارپائی پر لیٹ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد غنودگی کی حالت میں پہنچ گیا۔ حالتِ غنودگی میں دیکھ رہا ہوں کہ جیسے چارپائی پر چت لیٹا ہوا ہوں اور میری نظریں نیلگوں آسمان پر شمال، شمال مغرب اور شمال مشرق کا پورا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ منظر کچھ ایسا ہے کہ آسمان بالکل نیلا دِکھ رہا ہے جیسے سردیوں کی دو یا تین دن کی بارشوں کے بعد بادلوں کے غائب ہونے کے بعد سارا آسمان دھلا ہوا اور نکھرا نکھرا دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح کا منظر ہے کہ یکایک شمال اور شمال مغربی افق پر کچھ شکلیں نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہیں جو دور سے ہوائی جہاز کی مانند دکھائی دیتی ہیں لیکن جیسے جیسے نزدیک آتی ہیں ان کی ہیئت اور شکلیں بالکل تبدیل ہوتی ہیں۔ ہوائی جہاز کے برعکس ان پر اسرار اُڑان بھری اجسام کی ماہیئت بے حد عجیب و

غریب ہے۔ کسی خاص مشینری کی طرح، لیکن ایک دوسرے سے مختلف نظر آتی ہے۔ اور ایک محدود تعداد میں افق پر اڈتی نظر آرہی ہے۔ ان اجسام کو اگر ٹینک نمایا کرین کی طرح کے اجسام سے تشبیہہ دی جائے تو شاید کسی حد تک قرینِ قیاس ہو۔ بہر حال ایسی شکل وصورت اور ماہیئت کی حامل ان مشینوں کو شاید ہی میں نے کبھی اپنی زندگی میں دیکھا ہو۔ اگر ڈرلنگ رِگ کی بات کریں جو دورانِ فیلڈ ورک کبھی آئل سائیٹ پر دیکھی ہو اور وہ بھی صرف ایک نظرِ طائرانہ سے زیادہ وقت کے لیے نہیں تو اور بات ہے، مگر یہ اُڑتے ہوئے پُراسرار اجسام کسی اور نظام اور عمل کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ اب مزے کی بات یہ ہے کہ یہی خواب اسی طرح کے ماحول اور وقت پر کئی بار دیکھنے کو ملا۔ بلکہ مجھے بھی کچھ کچھ اچھا لگنا شروع ہو گیا کہ ان بھاری بھرکم مشینوں کو آسمان پر اُڑتے ہوئے دیکھوں اور پہچاننے کی کوشش کروں۔

ایک دن تو بہت عجیب خواب آیا۔ اور وہ کچھ اس طرح سے تھا کہ میں وہیں اپنے گھر کی چھت پر چارپائی پر لیٹا ہوا ہوں اور غنودگی طاری ہو گئی ہے۔ اب کی بار جنوب اور جنوب مغربی سمت ہے اور نظارہ افقی یا آسمانی نہیں بلکہ میدانی ہے لیکن میدان سرمئی رنگ کے پہاڑی سلسلے اور چٹانوں پر محیط ہے۔ ان سرمئی پہاڑوں پر پیدل چلنے کے راستے نمایاں ہیں جن پر انسان اور جانور خاص طور پر پالتو چوپائے بکثرت حالتِ آمدورفت میں رہنے کی وجہ سے بالکل تازہ بہ تازہ نشان زدہ ہیں۔ بکریوں کے ریوڑ کی تحریک اور اس کے نتیجے میں مینگنیوں کا سرِ راہ موجود ہونا

نظر آرہا ہے۔ ساتھ ساتھ راستوں کے دائیں بائیں ذرا ہٹ کر جھونپڑی نما دیہی گھر ایک دوسرے سے فاصلے پر نظر آرہے ہیں۔ اب اس میں ایک بات تو مسلمہ ہے کہ ایم ایس سی کے دوران وہ جو دوماہ کا فیلڈ پروگرام کیا تھا وہ مانسہرہ اور ایبٹ آباد کے علاقہ کا تھا۔ لیکن وہاں کے ماحول اور ٹوپوگرافی اس خواب میں دکھائی دینے والی ٹوپوگرافی سے بالکل مختلف اور علیحدہ نظر آئی۔ خوابدیدہ پہاڑی سلسلہ کی ایک خاص بات اس کا کم سطحی ہونا بھی تھا جبکہ مانسہرہ اور ایبٹ آباد کے پہاڑی سلسلے اونچے اور بالا مسطح پر موجود ہیں نیز ان میں ہریالی کا تناسب بھی اس علاقے کی خوشنمائی اور دیدہ زیبی کو بڑھانے میں معاون ہوتی ہے جبکہ خوابدیدہ علاقہ سبزے سے بالکل نہیں تو بیشتر تناسب سے محروم دکھائی دیا۔ یعنی اگر لاشعور میں پھنسے ہوئے محل وقوع اور علاقہ کی ماہیئت کو دیکھا جائے یا یہ سمجھا جائے کہ خواب کی کمپوزیشن اور لاشعور میں محفوظ کمپوزیشن کا باہمی تعلق ہی اس خواب کی وجہِ تسمیہ بنا تو مجھے ایسا اس لیے نہیں لگتا کیونکہ جب میں نے جیالوجی سے متعلقہ نوکری شروع کی اور معدنی سروے کا کام شروع کیا تو ان علاقوں کا محل وقوع، ٹوپوگرافی، ان پہاڑی علاقوں میں بنے ہوئے جانوروں کے ریوڑ کے نشانات اور جھونپڑی نما گھر غرضیکہ ہر چیز واضح طور پر دکھائی دی اور ان نشانیوں کا خوابدیدہ حالات میں دکھائی دینا سمجھ میں آنا شروع ہو گیا۔

اسی طرح ایک خواب جس کا آدھا حصہ تو یقیناً میرے لاشعور میں پھنسی ہوئی یادداشتوں پر محیط تھا جبکہ دوسرا حصہ کہ جہاں میں موجود تھا، وہ بالکل

شعوری اور لاشعوری دنیا سے مختلف تھا۔ یعنی میں خواب میں مچھلی کا شکار کر رہا ہوں۔(بچپن میں مچھلی کا شکار کرنا مرغوب ترین مشغلہ رہا ہے) لیکن جس جگہ میں شکار کر رہا ہوں وہ ایک بڑی ہائی وے کے ساتھ نہر ہے جو اس ہائی وے کو نوّے درجہ کے زاویہ سے کاٹتی ہوئی جنوب کی سمت رواں دواں ہے اور اس نہر کے مغربی کنارے کے دامن میں ایک تالاب واقع ہے اور تالاب کے کنارے پر دو یا تین درخت ہیں۔ ان درختوں کی چھاؤں تلے میں مچھلی کے شکار کے لیے تگ و دو کر رہا ہوں۔ اب اگر تعبیر دیکھی جائے تو مچھلی کا شکار کرنا روٹی روزی حاصل کرنا ہے یا پیسے کمانا ہے اور یہ مشغلہ چونکہ بچپن سے میرے ساتھ ساتھ رہا ہے، اس لیے یہاں تک تو کوئی خاص بات نوٹ کرنے والی نہیں لیکن خاص بات اس تالاب اور اس کے ارد گرد والا ماحول اور منظر نامہ ہے، جو خواب میں نظر آ رہا ہے۔

اس خواب کی تعبیر اس وقت پوری ہوئی جب میں لاہور سے ڈی جی خان اور پھر ڈی جی خان سے سخی سرور کی طرف جا رہا تھا اور اس خاص مقام کو ڈی جی خان نہر کو کراس کرتے وقت دیکھا اور طبیعت میں چونکنا پن محسوس ہوا۔ یہ محسوس ہوا کہ میں پہلے بھی اس مقام کو دیکھ چکا ہوں۔ وہاں پر رک کر اچھی طرح مشاہدہ کیا اور ویسے ہی تالاب اور چھاؤں دار درخت اور نہر کا مغربی کنارہ سب کچھ ویسے کا ویسے ہی پایا جو خواب میں دیکھا۔

اب یہ بعد کی بات ہے کہ اس علاقہ میں روزی تلاش کرتا رہا، پیسے کماتا رہا اور تقریباً 14 سال کا عرصہ اس مقام کے چاروں طرف یعنی شمال میں تونسہ، وہوا،

جنوب میں راجن پور، مشرق میں ملتان، مظفر گڑھ اور مغرب میں فورٹ منرو تک حالتِ سفر و حضر میں گذرا۔

اب آگے اس سلسلۂ خواب کے پہلے حصے کی طرف آتا ہوں جہاں مختلف نوعیت کی مختلف اشکال اور ہیئت کی مشینوں کو فلک میں محوِ پرواز دیکھتا ہوں اور جیسا کہ میں نے پہلے بتایا، یہ مشینوں کا فلک میں پرواز کرنا اور خاص طور پر شمال سے جنوب کی طرف رُخ کرنا میں نے بارہا دیکھا اور ہر دفعہ حالتِ بیداری میں ان کی بابت خوب سوچ بچار اور فکر کرتا کہ آخر یہ کس قسم کے مظاہر ہیں اور مجھے کیا دیکھنے کو مل رہا ہے۔ یہ ایک ایسا خوابوں کا سلسلہ تھا کہ میں نے ان کو کسی کے ساتھ بانٹنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ بس دیکھتا رہا اور ازبر کرتا رہا۔ شاید اس لیے بھی بانٹنا مناسب نہیں سمجھا کہ ایک تو میں خود بھی خوابوں پر اتنا پُریقین نہ تھا، دوسرا مجھے کوئی خاص سمجھ بوجھ بھی نہیں تھی اس لیے کسی اور کے ساتھ بھی ذکر نہیں کیا۔

لیکن جب دورانِ ملازمت مختلف جگہوں پر جانے کا اتفاق ہوا جہاں معدنیات کے لیے کھدائی اور زیرِ زمین مائننگ جیسے عوامل دیکھنے کو ملے تو ساتھ ہی بڑی بڑی مختلف اشکال کی زمین پر متحرک رہنے والی مشینیں جن میں ڈوزر، کرین، ڈرلنگ رِگ (پہیوں والی) باؤزر، مَڈ پمپس، لوڈرز، ٹرکس اور نہ معلوم اور کئی قسم کی مشینوں کو دیکھنے کے مواقع ملے۔

اب کی بار انتہائی چونکنے کا وقت تھا۔ وہ یہ کہ یہی وہ مختلف اشکال کی مشینیں تھیں جن کو میں خوابیدہ حالت میں آسمان پر اُڑتا ہوا یا رینگتا ہوا دیکھا کرتا

اور کئی دفعہ اس نظارے سے دیدہ ور ہوا۔

میرے اپنے خیالات کے مطابق قدرت مجھے میرے مستقبل کے بارے میں اطلاع دے رہی تھی کہ تمھارا واسطہ اس علاقے میں ان مشینوں کے ساتھ اور روزی روٹی کا بندوبست منسلک کر دیا گیا ہے اور اسی میں برکت بھی ڈال دی گئی ہے اور یقین کریں کہ واقعی ڈی جی خان کے علاقے میں خوب روٹی، عزت اور مقام و مرتبہ عطا ہوا۔ یقیناً جو اللہ تبارک و تعالیٰ جانتے ہیں وہ انسان نہیں جان سکتا اور مقامِ شکر بھی یہی ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی سو فیصد محنت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کی رحمتوں اور نعمتوں کے مزے لوٹیں۔

خصوصی محکمہ گورنمنٹ آف پاکستان ڈی جی خان میں ڈیلی ویجر بھرتی اس وقت کی ضرورت کے حساب سے ٹھیک تھی۔ میری بھرتی بھی ڈیلی ویجر ملازم کی حیثیت سے تھی اور مشاہرہ تقریباً 52 روپے روزانہ کا تھا۔ اس مشاہرہ میں ہر سال بتدریج اضافہ ہوتا گیا اور بڑھتے بڑھتے 72 روپے روزانہ ہو گیا۔ رہائش بھی آفیسر میس میں نہیں تھی بلکہ سینیئر اور جونیئر سٹاف ملازمین کے ساتھ خیموں میں تھی۔ اب روزانہ ریگولر آفیسرز کا رہن سہن اور ان کو مہیا سہولتوں کو دیکھ دیکھ کر دل کی کیفیت کافی مد و جزر کا شکار رہتی جبکہ تعلیمی قابلیت ان کے ہم پلہ تھی لیکن اس کڑواہٹ کو صرف اپنے دل کی حد تک رکھا۔ زبان سے کبھی کسی شخص کے ساتھ ذکر نہ کیا کہ مبادا ناشکری کے درجہ میں آجاؤں۔ بہر حال وقت گذرتا رہا اور اپنی مکمل تگ و دو کو بروئے کار لاتا رہا۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خیالی کیفیت میں

اظہار کرتا رہا یہاں تک کہ تقریباً پونے دو سال کا عرصہ گذر گیا۔ اب یہاں پر ایک بار پھر پیغام بر خواب دیکھا جو کچھ یوں تھا کہ؛

## مستقل نوکری

ہمارے پرانے گھر E-232 رحمان پورہ کالونی کا منظر ہے۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا ہوں اور کمرہ بھی کوئی خاص بڑا نہیں بمشکل 10x12 مربع فیٹ کا ہو گا لیکن خواب میں وہ ایک وسیع و عریض قطعہ بن گیا جس میں ایک جمِ غفیر موجود ہے اور کسی بہت اہم شخصیت کا انتظار ہو رہا ہے۔ میں بھی اسی مجمع کا حصہ ہوں اور ظاہر ہے کہ میرا اپنا کمرہ ہے اس لیے میری موجودگی تو مسلمہ تھی بہر حال تھوڑی دیر کے بعد کیا منظر بنتا ہے کہ جناب محمد خان جونیجو وزیر اعظم پاکستان تشریف لاتے ہیں اور کھڑے کھڑے احکامات صادر فرمانا شروع کر دیتے ہیں۔ اس دوران میری نشست جناب وزیر اعظم صاحب کے بالکل سامنے آجاتی ہے اور مجھے وہ دیکھ لیتے ہیں۔ ہماری آنکھیں چار ہوتے ہی وہ اپنا دایاں ہاتھ دراز کرتے ہیں اور میری طرف بڑھاتے ہیں۔ میں بھی اپنا دایاں ہاتھ بڑھاتا ہوں اور ان کے ساتھ مصافحہ کرتا ہوں۔ مصافحہ کرتے وقت وزیر اعظم پاکستان کے چہرے سے تبسم جھلکتا ہے اور میں بھی خوب اطمینان محسوس کرتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد فجر کی اذان کے ساتھ ہی آنکھ کھل جاتی ہے اور میں اپنے وجود میں ایک خاص قسم کی طمانیت محسوس کرتا ہوا ہشاش بشاش اٹھتا ہوں۔ وضو کر کے نماز ادا کرنے مسجد جاتا ہوں اور مسجد سے واپسی تک خواب نہ صرف یاد رہتا ہے

بلکہ دھیما دھیما سکون سا طاری رہتا ہے۔

اس خواب کے وقوع پذیر ہونے کے چند ماہ بعد ہی اخبارات میں محکمہ نے سائنس دان اور انجینئرز کی بھرتی کے لیے امیدواروں سے درخواستیں طلب کر لیں اور تحریری امتحان و زبانی انٹرویو کے بعد میری نوکری پکی ہو گئی۔ میں بھی دوسرے آفیسرز کی طرح وہی مراعات اور اعزازات استعمال کرنے لگ گیا جو ادارے کے مروّجہ قانون کے تحت تھے۔

## بے نظیر بھٹو کی دوسری معزولی

یہ غالباً مئی 1996ء کا ذکر ہے جب بے نظیر بھٹو وزیر اعظم پاکستان تھیں اور جناب فاروق احمد خان لغاری صدرِ پاکستان تھے۔ ملک کے سیاسی معاملات حسبِ معمول ایسے ہی تھے جیسا کہ ہمارے ملک کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ ملک کے سیاسی حالات سے دل چسپی بس واجبی سی تھی۔ بس یہ سمجھ لیں کہ جون کے بجٹ کا انتظار رہتا کہ تنخواہ میں اضافہ کتنا ہو گا اور کیا کیا مزید مراعات ملیں گی وغیرہ وغیرہ۔ ویسے بھی ہمارے ذیلی کیمپ زیادہ تر ریموٹ علاقوں میں ہوتے جہاں سوائے ریڈیو کے اور کوئی اطلاع رسانی کا ذریعہ جیسا کہ اخبارات یا ٹیلی ویژن کے وسائل تھے بالکل ندارد تھے۔ ریڈیو بھی کرکٹ کمنٹری یا رات کے ماحول کو بارونق رکھنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ چونکہ 30 دنوں کے بعد جب چھٹی کے لیے گھر جاتے تو حالاتِ حاضرہ سے آگاہی ہوتی اور والدِ محترم اللہ انھیں غریقِ رحمت کرے، کبھی کبھار سیاسی صورتِ احوال کا ذکر کرتے، لیکن یہ معاملہ

شعوری طور پر کبھی بھی سنجیدہ طور پر ذہن میں جگہ نہ بنا سکا۔

یہ انھی دنوں کا واقعہ ہے، ہم سب لوگ ڈی جی خان کے دور افتادہ پہاڑی علاقہ میں سروے کا کام کر رہے تھے جب رات کے آخری پہر خواب دیکھا کہ بے نظیر بھٹو وزیر اعظم پاکستان ایک وسیع و عریض بلڈنگ میں دوسری یا تیسری منزل میں موجود ہیں اور دفعتاً وہ پھسلتی ہیں اور سیڑھیوں پر گر جاتی ہیں۔ سیڑھیوں پر گرنے کے باعث اپنا توازن قائم نہیں رکھ پاتیں اور پھر سیڑھیوں سے گرتی ہوئی نیچے تیزی سے جا رہی ہیں۔ اندازاً 22 یا 23 سیڑھیوں سے گرتی پڑتی اور بالکل نیچے گراؤنڈ فلور پر دھم سے گر جاتی ہیں۔ اسی اثنا میں میری آنکھ کھل جاتی ہے اور خواب کی تازگی مزاج میں عجیب طرح کا غم اور ڈر سمو دیتی ہے۔ ظاہر ہے بلندی سے گرنا ایک طرح کے زوال کی نشانی ہے۔ بعد میں ویسے ہی ہوا۔ صبح کو کیمپ میں شور پڑ گیا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی کابینہ تحلیل کر دی گئی ہے۔ اب وہ وزیر اعظم کے عہدہ پر نہیں رہیں۔ عالمِ بیداری میں طرح طرح کے لوگوں کی مختلف قسم کی باتیں کانوں میں پڑ رہی تھیں لیکن میں بالکل ساکت و جامد رات کے خواب میں پھنسا ہوا تھا اور حیران و پریشان تھا کہ خواب میں اس خبر کی اطلاع مجھے کیسے ملی۔

## خواب میں چاند دیکھنا

خواب میں چاند دیکھنا وہ بھی مختلف حالتوں میں، مثلاً چودھویں کا چاند، آدھا چاند، نیا چاند، گہن والا چاند مختلف تعبیرات کے زمرے میں آتا ہے۔

چودھویں کا چاند مکمل کامیابی اور خوشی کا اشارہ ہے، اسی طرح آدھا اور نیا چاند کامیابی کی منازل کی نشاندہی کرتا ہے جبکہ گہنایا ہوا چاند منفی اثرات رکھتا ہے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے، غالباً 2003 کی، جب میری محکماتی پروموشن (ترقی) گریڈ 18 سے گریڈ 19 میں ہونا تھی اور ہم لوگ فیلڈ ورک کر رہے تھے کوہاٹ پلیٹو میں۔ ایک رات خواب میں دیکھا کہ میں اور امتیاز حسین منہاس صاحب (چیف سائنٹسٹ ریٹائرڈ) دونوں ایک پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھے ہوئے ہیں اور چاند کی چاندنی ہر سو پھیلی ہوئی ہے یہاں تک کہ ارد گرد کے مناظر چاندنی کی روشنی میں واضح نظر آرہے ہیں۔ ہم دونوں بظاہر اس طرح بیٹھے ہیں جیسے انتھک فیلڈ ورک کے بعد تھوڑی دیر سستانے کے لیے بیٹھا جاتا ہے اور تھوڑی گپ شپ بھی ہوتی ہے۔ اسی دوران ہم دونوں نے دیکھا کہ چاند جہاں پہاڑی کی چوٹی پر ہم بیٹھے ہیں اس کے بالکل نیچے واضح طور پر چمک رہا ہے اور مکمل چودھویں رات کے چاند کی مانند نہ صرف مکمل ہے بلکہ اپنی روشنی بھی پھیلا رہا ہے۔ ہم دونوں خواب میں حیران ہوتے ہیں کہ چاند پہاڑ کے اوپر آسمان پر چمکنے کی بجائے پہاڑ کے نیچے یا پاؤں کی طرف کیوں ہے۔ بڑا عجیب منظر تھا کہ یہ عمل پہلے کبھی نہ دیکھا یا سنا بہرحال کچھ دنوں کے بعد پروموشن کی کامیابی کی خبر کے ساتھ ہی اس خواب کی تعبیر کا بھی کچھ کچھ اندازہ ہو گیا۔

اسی طرح محمد بلال قریشی صاحب کی پیدائش ہونا تھی اور خواب کچھ ایسے آرہے تھے کہ تعبیر ہلکے ہلکے انداز میں بیٹے کی پیدائش کی طرف منسوب ہو رہی

تھی۔ ایک رات خواب میں دو چاند نظر آئے اور یہ کافی بڑے سائز کے تھے۔ اس حیران کن خواب کے بعد ایک اور خواب میں چار چاند دیکھے یعنی ہر سمت میں ایک چاند اور حیرت کی انتہا یہ تھی کہ ان سب کا سائز ایک ہی طرح تھا اور یہ سب خوب روشن بھی تھے۔ ان چار چاندوں کی منظر کشی جو چار سمت میں نظر آنے کی تعبیر اس وقت معلوم اور مکمل ہوئی جب ہم تین بھائیوں اور ایک بہن کو دو ہفتوں کے وقفے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بیٹوں سے نوازا۔

## پرویز مشرف کا واقعہ

میرے ایک نزدیکی عزیز ہیں ان کی پراپرٹی کا کوئی معاملہ درپیش ہو گیا۔ جسے حل کرنے کی انھوں نے بہت کوششیں کیں لیکن کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ کئی جگہ رشوتیں بھی دیں لیکن لاہور ڈیویلپمنٹ اتھارٹی ایل ڈی اے نے ان کا کیس لٹکائے رکھا۔ پراپرٹی ان کی تھی لیکن ان کے نام نہیں ہو رہی تھی۔ متعلقہ دفتر کے چکر پہ چکر لگائے جا رہے تھے لیکن حاصلِ مقصود صفر ہی تھا۔

اب معاملہ کچھ ایسا تھا کہ یہ صاحب خود تو پاکستان میں نہیں تھے بلکہ تلاشِ روزگار کے سلسلے میں کسی خلیجی ملک میں قیام پذیر تھے اور پاکستان کا سفر باقاعدگی سے نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے وقت اور پیسہ بچانے کے لیے مجھے یہ ذمہ داری سونپ دی، کہا؛ برائے مہربانی اس کیس کو ہینڈل کریں۔ پاور آف اٹارنی ملنے کے بعد میں نے کیس لے لیا، لیکن میری اپنی نوکری زیادہ تر لاہور سے باہر پہاڑی علاقوں میں سروے سے متعلق تھی۔ اس کام میں رکاوٹیں آنا شروع ہو گئیں۔

ساتھ ساتھ بچوں کے سکول اور بیمار والدہ کے معاملات، غرض یہ کہ ایل ڈی اے کے دفتر اور اپنے دفتر کے چکر، دوسرے کلرکوں کے ساتھ ڈیل، معاملات کافی گھمبیر ہو گئے اور میں کافی اکتاہٹ محسوس کرنے لگا۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوا کہ اس کیس کا ایک مخالف فریق بھی تھا وہ بے حد Non-cooperative تھا۔ اس کا رویہ اس کیس کو منطقی انجام تک پہنچانے میں کافی منفی سا تھا۔ یہ کیس غالباً 2002 کا تھا جن دنوں ملکِ عزیز پر جنرل پرویز مشرف کی حکومت تھی اور ان کا سکّہ ہر سو چلتا تھا۔ گویا ایک طرح سے وہ ہر معاملہ میں سمبل آف پاور تھے۔ اب یہ خصوصیت کسی بھی ملک کے سربراہ کی خواہ وہ بادشاہ ہے یا دورِ جدید کے مطابق وزیر اعظم یا صدرِ مملکت، دنیاوی اور روحانی دونوں اعتبار سے متعلقہ مکمل اثر و نفوذ رکھتی ہے۔ جنرل پرویز مشرف ملکِ پاکستان کے بلاشبہ دنیاوی اور روحانی سربراہ تھے اس لیے جو خواب آگے آرہا ہے وہ بھی اس بات کا غماز ہے کہ خواب کی حالت میں اگر کوئی سربراہِ ملک آپ کو کوئی تحفہ یا میڈل یا کوئی بھی مادی و روحانی چیز عطا کرتا ہے تو یہ آپ کے لیے خوش بختی کی علامت ہے۔ چنانچہ بغیر کسی خیال کے میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ باوجود انتھک کوشش کے اور دفاتر کے دھکے کھانے کے جب متعلقہ کام نہ ہوا تو سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیا۔ شاید یہی وہ گھڑی تھی جب اللہ تعالیٰ نے اسی رات خواب میں کچھ اس طرح کا منظر دکھایا کہ میں حسبِ معمول ایل ڈی اے کے دفتر میں گیا ہوں اور وہاں ایک کمرہ میں پرانی سی میز اور دو عدد کرسیاں رکھی ہوئی ہیں۔ کمرے کی

آرائش کچھ ایسی تھی کہ ہیڈ کلرک ٹائپ سرکاری عہدیدار شخص کا ہے اور مجھے کسی آواز دینے والا نے کہا کہ آپ یہاں کچھ دیر انتظار کریں، ابھی صاحب آتے ہیں اور آپ کو مطلوبہ دستاویزات دیتے ہیں۔

کچھ ہی دیر کے بعد منظر یہ تھا کہ سفید شلوار قمیض اور پشاوری چپل پہنے جناب جنرل پرویز مشرف صاحب تشریف لاتے ہیں اور اس کرسی اور میز پر بیٹھ جاتے ہیں جو کسی عہدیدار کے لیے آراستہ کی ہوتی ہے۔ کرسی پر آرام سے بیٹھنے کے بعد میری طرف متوجہ ہوتے ہیں اور سلام دعا ہوتی ہے۔ جنرل صاحب کے چہرے پر انتہائی سکون اور نرماہٹ ہے۔ مجھے دیکھتے ہی ایک فائل پر دستخط کرتے ہیں اور ایک کاغذ میری طرف بڑھا دیتے ہیں۔ میں وہ کاغذ وصول کر کے شکریہ ادا کرتا ہوں اور بغرض مشاہدہ جنرل صاحب کو دوبارہ دیکھتا ہوں۔ اس بار جنرل صاحب ہلکا ہلکا مسکرا رہے ہوتے ہیں۔ صبح نماز پڑھنے کے بعد میں نے اپنی اہلیہ کو بتایا کہ آج کام ہو جائے گا اور وہی ہوا کہ جب میں دفتر گیا تو وہاں میں نے مطلوبہ چٹھی وصول کر لی۔ الحمدللہ جو ذمہ داری اٹھائی تھی وہ پوری ہو گئی اور اپنے اس رشتہ دار کو بھی مطلع کر دیا۔ خدا کا شکر ادا کیا لیکن خواب والا معاملہ گول کر دیا۔

## پروموشن میں ناکامی

یوں تو پوری زندگی خوشی و غمی کا امتزاج ہے بلکہ زندگی ہی کیا پوری دنیا دو واضح حصوں میں بٹی ہوئی ہے، ایک حصہ دائیاں ہے تو دوسرا بائیاں۔ کہیں اندھیرا ہے تو کہیں اجالا۔ نیکی اور برائی دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ اس پیرائے میں لمبی

فہرست بنتی ہے کہ اگر اس لمبی فہرست کو مرتب کرنے میں لگ جائیں تو اصل مدعا کی طرف سے دھیان ہٹ جاتا ہے۔ بس قصہ مختصر یہ ہے کہ مثبت اور منفی معاملات کا سارا کھیل ہے۔ خوشی اور غمی اس فہرست میں موجود ہیں اور نمایاں مقام رکھتی ہیں اور ان کا انسانی زندگی کی بناوٹ، نکھار اور کندن نما خواص کا معرضِ وجود میں آنا ان کا خاصہ ہے۔

میں بھی اس عمل سے دوچار ہوا اور اکثر ہوا لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیشہ پہلے سے زیادہ نوازا۔ ہوا یوں کہ ایک بار محکماتی پروموشن انٹرویو میں باوجود بے حد کامیابی وکامرانی کے واضح اشارات کے، میں پروموشن حاصل نہ کرسکا اور ڈراپ ہوگیا۔ پہلے پہل تو اس ناکامی کا یقین ہی نہ آیا کیوں کہ میری کئی سالوں کی کارکردگی نہایت نمایاں رہی تھی اور ایک فیصد بھی امکان نہ تھا کہ یہ ترقی مجھے نہ ملتی لیکن اللہ تعالیٰ کے اپنے ہی فیصلے ہوتے ہیں جن تک انسانی دسترس نہیں ہوتی۔ بہرحال ترقی نہ ہوئی اور ناکامی کا یہ دھچکا جسم وجاں کو ہلا گیا۔ اب ظاہر ہے کہ قوت برداشت کا مظاہرہ بھی کرنا تھا اور اپنے آپ کو نارمل دکھائی بھی دینا تھا لیکن گوشت پوست کے انسان کے اندر کتنی طاقت اور برداشت ہوتی ہے؟ یہ وہی جانتا ہے جو اس مشکل راستے سے گزرتا ہے۔ سارا دن معمول کے مطابق آفس میں سرکاری امور سرانجام دیتا لیکن رات کو سوتے وقت یہ خیال ضرور آتا کہ آخر وجہ کیا بنی، کیوں میں ڈراپ ہوا؟ انھی ایام کے دوران جو خواب آتے وہ نہ صرف حیران کن تھے بلکہ میری سوچ سے دور دور دور تک مطابقت نہیں رکھتے تھے۔

مثلاً ایک رات خواب میں جناب اسلم صاحب جو ہمارے پروجیکٹ مینیجر رہے اور تقریباً دس سال سے زائد عرصہ پہلے غریق رحمت ہو چکے تھے، وہ خواب میں دکھائی دیئے۔ ویسے ہی جیسے آفس میں بیٹھا کرتے تھے اور ساتھ ایک بہت سینئر آفیسر طارق صاحب جن کے ساتھ میں نے پوری زندگی کام نہیں کیا لیکن سلام و دعا تھی اور اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ یہ دونوں حضرات بظاہر کسی سرکاری کام میں مصروف تھے جب طارق صاحب نے اسلم صاحب کو میری بابت بتایا کہ یہ عباس قریشی ہے اور اس کی ترقی نہیں ہوئی۔ یہ سن کر اسلم صاحب نے میری طرف دیکھا اور سر ہلا کر بولے، ہاں میں جانتا ہوں یہ سارا کام اس کے ممبر کا ہے۔ اس نے ہی اس کی ترقی روک رکھی ہے۔ کچھ ہی دیر کے بعد میری آنکھ کھل گئی اور میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ خواب کیسا تھا جو میں نے ابھی ابھی دیکھا ہے۔ اسلم صاحب عرصہ دراز سے ذہن سے موقوف ہو چکے اور اسی طرح طارق صاحب کے ساتھ بھی معاملات بس واجبی سے ہیں اور ترقی میں وجۂ ناکامی ممبر صاحب کو ٹھہرا رہے ہیں۔ بہر حال فجر کی نماز پڑھنے کے بعد دفتر جانے کی تیاری میں لگ گیا لیکن خواب دماغ کے ساتھ مسلسل چپکا رہا اور میں خواب کے تانے بانے بنتا رہا۔ میری ترقی کا نہ ہونا صرف میرے لیے انہونی نہ تھا بلکہ میرے رفقاء اور میرے دوستوں کے لیے بھی اچنبھے کی بات تھی۔ اس لیے اس خواب کا تجزیہ اپنے طور کرتا رہا اور یہ بات سمجھ نہ آئی کہ میری ترقی میں ممبر صاحب کی ناراضگی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ بہر حال اسی دوران اگلی رات آ گئی اور خوابیدہ حالت میں جناب ممبر صاحب اپنے

رفقاء کے جلو میں نظر آئے۔ وہاں بھی کسی صاحب نے ممبر صاحب سے بات کی کہ عباس قریشی کی ترقی نہیں ہوئی۔ ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ ممبر صاحب بولے، عباس قریشی کو چاہیے کہ اپنے ڈائریکٹر کے ساتھ تعلقات بہتر کرے اور ٹھیک رکھے۔ یہ سننا تھا کہ بات ختم ہو گئی اور آنکھ کھل گئی۔ اٹھ کر نماز پڑھی اور بعد ازاں دونوں راتوں کی خوابیدہ باتوں کا تجزیہ کرتے ہوئے دفتر کی جانب محو سفر ہوا۔ اب یہ سارا حیران کن معاملہ جو ان خوابوں کے آنے سے ہوا اور جب تانا بانا بنا گیا تو بات اپنے ڈائریکٹر پر آ گئی۔ یہ وجہ کسی حد تک قرین قیاس بھی تھی۔ اور اس وجہ کو جب تکنیکی طور پر کھنگالا تو ڈائریکٹر صاحب سے ایک دن ہلکی پھلکی بحث بھی ہو گئی۔ میں نے ڈائریکٹر صاحب کو کہا کہ میری ACR آپ لکھتے ہیں مجھے لگتا ہے کہ آپ نے میری ACR کی تشخیص صحیح نہیں کی۔ ڈائریکٹر صاحب بولے تمھاری ACR کا تمھاری ترقی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں کیوں کہ تمھاری ACR ہمیشہ Outstanding رہی ہے باقی وجہ کیا ہوئی تمھاری ترقی نہ ہونے کی تو یہ بات میری بھی سمجھ سے باہر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ خیر ایک سال کا دورانیہ غیر محسوس طور پر گزر گیا اور میرے نئے ڈائریکٹر جنرل آ گئے۔ نئے DG صاحب میرے ماضی کو خوب جانتے تھے اور ان کا میرے ساتھ معاملہ کافی مشفقانہ بھی تھا۔ کام کرنے والے کو خوب پہچانتے تھے۔ اگلا سال آیا تو میرے ساتھ میرے پروموشن انٹرویو کے لیے ہیڈ کوارٹر آئے اور حسب دستور انٹرویو بورڈ کے سامنے میرے وکیل کے طور پر بیٹھے۔ انٹرویو ہو گیا اور پتا بھی نہ چلا اور ہم لوگ انٹرویو کے کمرے سے باہر آ گئے۔

چند دنوں کے بعد میرے نئے DG صاحب نے مجھے بتایا کہ انٹرویو بورڈ میں ایک صاحب نے ان سے دریافت کیا کہ تم عباس قریشی کو کیوں لے کر آئے ہو، اس کو تو ہم نے پچھلے سال کلیئر کیا تھا۔ یہ بات جب مجھے یاد آتی ہے تو وہ سارا خواب جو دو اقساط میں آیا اور جو میں نے بیان کیا، من و عن ذہن میں اتر آتا ہے اور ساتھ ہی اس کی تعبیر بھی۔ بہرحال اللہ تبارک و تعالیٰ نے میری آزمائش کی اور اس تازہ انٹرویو کے بعد میری محکمانہ ترقی ہو گئی۔ اس ترقی کے بعد جو رحمتیں اور نعمتیں عطا ہوئی وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا خصوصی انعام تھیں۔

باب پنجم

# حیرت انگیز واقعات

## گھریلو ملازم

یہ واقعہ اتنا دلچسپ اور مزیدار ہے کہ آپ بھی اس کو پڑھنے کے بعد میری اس بات سے متفق ہو جائیں گے۔ لیکن یہ واقعہ میں نے شاید ہی اپنے جاننے والوں اور دوستوں میں بانٹا ہو۔ شاید ایک آدھ دفعہ اپنی اہلیہ سے ذکر ضرور کیا ہو لیکن ان کو یاد ہے کہ نہیں، یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ میں نیا نیا اپنے محکمہ میں چنا گیا تھا اور میرا رینک تھا اسسٹنٹ جیالوجسٹ کا۔ جیسا کہ عہدہ بتا رہا ہے کہ میں ویسے تو آفیسر رینک گریڈ 16 میں تھا لیکن اس قابل نہیں تھا کہ پوری طرح آفیسر کہلا سکوں۔ اس کے علاوہ مراعات اور سہولیات بھی پورے آفیسر کے قد کی طرح نہیں تھیں اور دوسری اہم بات یہ کہ گریڈ 17 کے افسران کے ساتھ ان کے اسسٹنٹ یا چھوٹو کی طرح کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ میرے

سینیئر افسران نہایت شریف النفس اور اعلیٰ انسانی اقدار کے حامل تھے۔ اس لیے انھوں نے کبھی بھی مجھے جونیئر کیڈر کا آفیسر سمجھتے ہوئے رگڑا لگانے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن میں نے چونکہ ڈیلی ویجر مدت گزاری ہوئی تھی اس لیے معاملاتِ سینیئر اور جونیئر سے کافی آگاہ تھا، اس کے علاوہ میری اپنی بھی کوشش ہوتی تھی کہ میرے کسی سینیئر آفیسر کو مجھے ڈانٹنے کی یا تنبیہ کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ میں خوب دل لگا کر پورے جوش و جذبے کے ساتھ ذہنی اور جسمانی طاقتوں کو بروئے کار لا کر کام کرتا تھا۔ پہاڑ پر چڑھنا اور اترنا دونوں ہی کافی تھکا دینے والے عمل ہیں، اس کے علاوہ رات کے آدھ پہر تک فیلڈ ورک کے تمام امور تحریر کرنا اور جو بھی نمونہ جات اکٹھے کیے ہوتے ان کو پیک کرنا، ان کی تفصیل لکھنا اور وہ بھی لالٹین کی روشنی میں، تو سارا معاملہ انتھک محنت کا بن جاتا تھا۔ علاوہ ازیں ٹینٹ لائف جس میں پانی کی راشن بندی پیش پیش رہتی تھی اور نہانے کے لیے شاید روزانہ ایک ہی بالٹی دستیاب ہوتی۔ یہ فیلڈ ورک کم از کم ایک ماہ چلتا اور اس کے دوران چھٹی کا کوئی موقع نہ آتا۔ بلکہ بعض اوقات تو ڈیڑھ ماہ تک ہم ہوتے فیلڈ ورک ہوتا یا ایک ٹینٹ جس میں کم از کم دو افسران تو ضرور ہوتے۔ کچھ میرا رنگ بھی ماشاءاللہ سے پاکستانی (گندمی) ہے اور فیلڈ ورک میں کھلے آسمان اور دھوپ میں آٹھ دس گھنٹے چلتے رہنا یا کام کرنا بھی اس کو مزید پالش کرتا رہتا۔ غرض یہ کہ داڑھی بڑھ جاتی، سر کے بال بے ترتیب ہو جاتے اور جلد

سخت کھردری اور کالی ہو جاتی۔ جب دن گنتے گنتے وہ دن آجاتا جب ہماری چھٹی شروع ہوتی تو یہ یقین کریں ماسوائے گھر جانے کے ولولے اور جوش کے کوئی اور رکاوٹ سامنے نہ آتی۔ دو دن پہلے ہی اپنا سفری بیگ تیار کر لیتے اور سفری کپڑے بھی ہینگر کے ساتھ پرو کر ٹینٹ میں ٹانگ دیتے۔ علی الصبح نماز کے بعد نہاتے اور ناشتہ کے فوراً بعد لاہور جانے کے لیے کوئی بھی دستیاب گاڑی، بس یا ویگن میں بیٹھ جاتے۔

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب نیو خان ویز والوں نے ڈی.جی خان سے لاہور بڑی ایئر کنڈیشنڈ بسیں چلانا شروع کی تھیں۔ اور ان بسوں کی سروس اور ڈرائیوروں کی مہارت کے قصے زباں زد عام تھے، خاص طور پر ان لوگوں کے جو لاہور، فیصل آباد اور گجرات وغیرہ کے مسافر ہوتے تھے۔

چنانچہ میں بھی ایک دن فیلڈ کیمپ سے چالیس دن کا قیام مکمل کرنے کے بعد چھٹی لے کر ڈی.جی خان سے نیو خان بس میں بیٹھ کر اور ایئر کنڈیشنڈ سفر کے مزے لے کر لاہور کے لیے روانہ ہوا۔ بس نے جلدی ہی ملتان پہنچا دیا۔ یہاں شاید دس یا پندرہ منٹ کا قیام کیا اور پھر بس روانہ ہو گئی۔ ہاں بس اتنا یاد ہے کہ ساہیوال میں آدھ گھنٹے کا قیام تھا۔ یہاں میں سارے رستے سویا رہا۔ بس غالباً چوھنگ میں رکی اور "نماز پڑھ لیں" کی آواز سن کر نیچے اترا۔ وضو کیا، نماز فجر ادا کی۔ جلد ہی ڈرائیور نے بس پھر چلا دی۔ اب نیند والی کیفیت ختم ہو گئی اور میں

ہشاش بشاش ہو کر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بس لاہور میں ملتان روڈ پر خراماں خراماں چل رہی تھی اور پھر قسمت یاوری یہ ہوئی کہ ٹھوکر نیاز بیگ سے کنال روڈ پر رواں دواں ہو گئی۔ میں نے جب یہ روٹ دیکھا تو خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا کہ مسلم ٹاؤن کے ساتھ ہی پیدل راستہ میرے گھر رحمان پورہ میں جاتا ہے اور زیادہ سے زیادہ 20 منٹ میں مَیں اپنے گھر پہنچ جاؤں گا۔ میں نے اپنی خوشی چھپاتے ہوئے ڈرائیور سے درخواست کی کہ نیو مسلم ٹاؤن موڑ ہے وہاں مجھے اتار دینا۔ ڈرائیور بھلا مانس تھا میری درخواست مان گیا اور اس نے مجھے میری مطلوبہ جگہ پر اتار دیا۔

میں بہت خوش بس سے نیچے اترا، بیگ کو دائیں شانے کے ساتھ لٹکایا اور بڑے بڑے قدم لیتا ہوا اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ ابھی چالیس پچاس میٹر کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ ایک 16 / 17 سال کے لڑکے نے مجھے روکا اور بغیر کسی تمہید یا سلام دعا کے مجھے کہنے لگا۔ بات سنو، کیا تم ہمارے گھر کا کام کرو گے؟ دراصل ہمارا گھریلو ملازم دو تین ہفتوں سے نہیں آ رہا شاید کام چھوڑ گیا ہے۔ پہلے پہل تو مجھے اس لڑکے کی باتوں کی سمجھ ہی نہیں آئی کہ کون سی زبان بول رہا ہے اور کیا بات کر رہا ہے۔ لیکن جب دوبارہ اس نے یہ ہی بات دہرائی تو مجھے ہر شے گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے بعد مجھے ایسا لگا جیسے میں ننگا ہو گیا ہوں۔ یعنی ایک اچھا بھلا گورنمنٹ آفیسر اور یہ اوقات کہ ایک چھوکرا اُس

کو گھریلو ملازم سمجھ رہا ہے اور ساری افسری اور افسرانہ چال ڈھال اور وقار اس کو
کچھ بھی نظر نہیں آرہا۔ شدید بے عزتی سے میرا سر گھوم گیا اور میں انتہائی غصہ کی
حالت میں آگیا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنا غصہ اس پر اتاروں میں نے اپنے آپ کو
غور سے دیکھا کہ کیا وجہ ہے یہ لڑکا مجھے ایزی کیوں لے رہا ہے اور میرے سٹیٹس کا
بیڑا غرق کرنے میں کیوں بڑھ چڑھ کر حملہ آور ہو رہا ہے۔ جب غور کیا تو میرا حلیہ
کچھ ایسا تھا کہ آٹھ دس گھنٹے کے سفر سے میرا لباس جو شلوار قمیض پر مشتمل تھا
وٹو وٹ (سارے کا سارا سلوٹ زدہ) تھا، بال بکھرے ہوئے، داڑھی الجھی ہوئی جو
میں نے لاہور میں اپنے محلہ کے ہیئر ڈریسر سے سلجھانے کے لیے ڈی جی خان کے
ہیئر ڈریسر کو تکلیف نہ دینے کی خاطر ویسے ہی چھوڑی ہوئی تھی اور جوتوں پر سفر
کی دھول، شانے پر لٹکایا ہوا سفری بیگ، غرض یہ کہ کسی صورت بھی افسرانہ تو
درکنار ایک مناسب شکل و صورت والا شریف آدمی بھی دکھائی نہیں دے رہا
تھا۔ لڑکا صحیح سمجھ رہا تھا اور اس کی چوٹیں جو بظاہر وہ معصومانہ انداز میں کر رہا تھا
میں سمجھ گیا کہ لڑکا ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں واقعی کسی صورت سے بھی ایک اعلیٰ
ادارے کا افسر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بلکہ کسی بھی گھریلو ملازم کے سٹیٹس سے
بڑھ کر نہیں تھا۔ بہرحال جلد ہی اپنے غصے پر قابو پایا اور بغیر کسی قسم کی بات
کرنے کے میں وہاں سے سیدھا اپنے راستے پر ہوا۔ لیکن جو کچو کا وہ لڑکا مجھے لگا گیا وہ
میرے دماغ میں سن سن کر رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ آئندہ سے فیلڈ سے لاہور

جب بھی آنا ہوا، اپنی وضع قطع، شکل و صورت کو مناسب وقت دے کر اس قابل بنانا ہے کہ کوئی اور بندہ گھریلو ملازم بننے کی آفر نہ کرے۔ اور نہ ہی شارٹ کٹ کے ذریعے گھر جانا ہے بلکہ مناسب سواری یعنی رکشہ یا ٹیکسی کے ذریعے باوقار طریقے سے گھر پہنچنا ہے۔

## جادو کی ہنڈیا

یہ انتہائی دلچسپ واقعہ میری زندگی کے ان چند واقعات میں سے ہے جس کا میں مزے لے لے کر جب بھی موقع ملتا ہے اپنے نزدیکی اور خاص کر عقل و فہم رکھنے والی شخصیات کے ساتھ ضرور ذکر کرتا ہوں۔ اس واقعہ میں سائنس کا علم رکھنے والے لوگوں کے لیے حیرت انگیز سامان ہے لیکن عقل و فہم سے عاری اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کے لیے ڈر، خوف اور سفلی عملیات میں سے ایک عمل کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

یہ واقعہ 1977 کے رمضان شریف کا ہے۔ ہم سب بھائی ماشاء اللہ سے ابھی اکٹھے ہی تھے اور اپنے آبائی گھر رحمان پورہ میں والدین، دادا جان اور سب سے چھوٹی بہن کے ساتھ قیام پذیر تھے۔ بڑی دونوں بہنوں کی خیر سے شادیاں ہو گئی تھیں اور وہ اپنے اپنے گھروں میں ہنسی خوشی رہ رہی تھیں۔ ہمارے آبائی گھر کا نقشہ کچھ ایسا تھا کہ (آٹھ مرلہ دو سو مربع فٹ) کے رقبہ میں آدھا مکان دو منزلہ تھا اور سب سے اوپر بالکونی تعمیر شدہ تھی جہاں تک جانے کے لیے سیڑھیاں

موجود تھیں جبکہ باقی آدھا مکان ابھی سنگل سٹوری اور تقریباً اسی حالت میں تھا جس حالت میں یہ مکان الاٹ ہوا تھا۔

والدہ محترمہ نے گرمیوں کے دنوں میں کھانا پکانے کے لیے سیمنٹ کی سیڑھیوں کے آغاز میں جو کہ برآمدہ کی ایک نکڑ پہ تھا اپنا چھوٹا سا باورچی خانہ بنایا ہوا تھا اور اس باورچی خانہ کی چھت نہیں تھی۔ باورچی خانہ کیا تھا بس ایک گیس کا چولہا تھا۔ والدہ گرمیوں میں یا بہ نسبت کھلے موسم میں وہیں کھانا پکاتی تھیں اور ہم سب لوگ ان کے اردگرد بیٹھ کر 'امی مجھے روٹی دیں، امی مجھے سالن دیں' کی گردانِ مسلسل میں اس وقت تک مصروف رہتے جب تک والدہ کھانا پکانے اور بانٹنے میں مصروف رہتیں اور ہم پیٹ بھر کر کھانا کھا کر اپنی راہ نہ لے لیتے۔

رمضان المبارک کے مہینے میں جہاں ہر سو رحمتوں اور برکتوں کی بارشیں ہوتی ہیں وہاں سحری اور افطاری کے مناظر بھی قابلِ دید ہوتے ہیں۔ میں جس واقعہ اور جس زمانہ کا ذکر کر رہا ہوں چونکہ وہ بھی رمضان شریف کے ماہِ مبارک کا ہے۔ اس دن افطاری کی تیاری ہو رہی تھی۔ والدہ محترمہ نے بڑے پریشر ککر کو گیس والے چولہے پر چڑھایا ہوا تھا اور ساتھ ساتھ افطاری کے لیے دودھ، روح افزا کے بڑے برتن میں برف اور چینی کی آمیزش کر رہی تھیں۔ پکوڑوں اور سموسوں کے علاوہ فروٹ چاٹ بھی تیار ہو رہی تھی۔ اسی دوران پریشر ککر کے اوپر ڈھکنے والا سٹیم ویٹ چلنا شروع ہو گیا جو اس بات کا غماز تھا کہ اب آپ لوگ مقررہ وقت نوٹ کر لیں اور مقررہ وقت کے بعد چولہا بند کر دیں۔ افطاری سے

ذرا پہلے ہم چند بہن بھائیوں نے کیرم بورڈ کی محفل سنبھالی تاکہ وقت کچھ اور مل جائے۔ ساتھ ہی والدِ مرحوم بھی ایک کرسی پر تشریف فرماتھے اور کبھی والدہ محترمہ سے کھانے کی صورتِ احوال دریافت کرتے اور کبھی ہماری کیرم کی بازی پر تبصرہ کرتے۔ دونوں بڑے بھائی جناب اویس قریشی اور الیاس قریشی صاحبان سب سے اوپر والی چھت جہاں سیڑھیاں مکمل ہوتی تھیں وہاں پر پتنگ بازی کا شغل کر رہے تھے۔ یہ ساری کیفیت دھیرے دھیرے روزہ افطار کی طرف جا رہی تھی کہ یکایک شوشو کی آواز آنا شروع ہوئی جو بعد ازاں باقاعدہ زوردار سیٹی میں بدل گئی اور پھر آناً فاناً بھاپ کا گھمبیر بادل چھا گیا۔ اس بھاپ کے بادل میں ہر چیز گم ہوگئی۔ والدہ محترمہ، والدِ محترم اور ہم سب جو ساتھ ہی کیرم بورڈ کھیل رہے تھے اس بھاپ کے بادل میں سموگئے اور کسی کو کوئی ہوش نہ رہا۔ نہ کوئی اس قابل تھا کہ ایک دوسرے کو دیکھ سکے۔ یہ کیفیت تھی تو شاید ایک منٹ سے بھی کم وقت کے لیے لیکن ہوش وحواس گم کرنے کے لیے کافی تھی۔

پھر کچھ ہی دیر بعد بھاپ کا بادل منتشر ہو گیا اور ایک ٹھنڈی پھوار کی شکل میں ہمارے اوپر گرنا شروع ہو گیا۔ منظر جو بری طرح دھندلا گیا تھا وہ بھاپ کے بادل کے ختم ہوتے ہی دوبارہ چمکدار ہو گیا اور ہم سب حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنا شروع ہو گئے۔ آنکھیں ایک دوسرے سے گویا سوال کر رہی ہوں کہ کیا ہوا؟ یہ سیٹی کا شور اور بھاپ کا بادل کیسے اچانک وجود میں آئے اور آناً فاناً بے چینی کی فضا پیدا کر گئے۔ اگلے چند لمحوں کے ان سوالات اور جوابات کے وقفہ میں

سب کی نظریں والدہ اور چولہے پر پڑیں تو اصل جھٹکا اب لگا۔ جھٹکا یہ تھا کہ پریشر ککر چولہے سے غائب تھا اور اوپر ڈھکنے والا ویٹ چولہے کے پاس ہی گرا پڑا تھا۔ ککر کہاں گیا؟ ککر کہاں گیا؟ ہر طرف شور مچ گیا۔ کیرم بورڈ کھیلنے والے یکدم اٹھے۔ والدِ مرحوم پریشان ہو گئے اور بھاگم دوڑ شروع ہو گئی کہ ککر کہاں گیا۔ ایک خوف کی فضا قائم ہو گئی کہ ویٹ نیچے چولہے کے اوپر ہے اور پریشر ککر غائب ہے اس خوف و پریشانی کی فضا جو پہلے ہلکی آوازوں کے ساتھ پیدا ہوئی آہستہ آہستہ شور و شرابہ میں ڈھل گئی اور ساتھ ہی ککر کی تلاش بڑی سرگرمی سے شروع کر دی گئی۔ اسی اثناء میں اوپر چھت پر دونوں بڑے بھائیوں نے نیچے صحن میں جھانکا اور ایک اہم اطلاع دی کہ کوئی اڑن طشتری نما چیز ہماری چھت کی طرف آئی ہے اور بعد میں پروجیکٹائل حرکت کرتے ہوئے مشرق کی طرف گئی ہے۔ اب مشرق کی طرف ہماری گلی اور دوسری گلی کے درمیان کم از کم 25 فٹ کا فاصلہ تھا جب کہ ہمارے گھر کے صحن اور دوسری گلی میں واقع گھروں کے صحن بھی 50 فٹ سے کم نہ ہوں گے۔ بہر حال کوئی 75 اور 100 فٹ کا زمینی فاصلہ اور اونچائی 40 فٹ تک فاصلہ ایک نامعلوم اُڑن طشتری نما چیز نے طے کیا۔ دونوں بھائیوں کو والدِ مرحوم نے نیچے بلایا اور ہم باقی چاروں بھائی ککر کی تلاش میں اپنے گھر سے متصل گلی کی طرف جہاں ککر کی پرواز کے بعد لینڈنگ کا شبہ ہوا تھا چل پڑے۔ تلاش کوئی زیادہ نہیں کرنا پڑی کیونکہ ہمارے گھر کے بالکل سامنے والا گھر جناب مقبول رضا جعفری (مرحوم) کا تھا۔ وہاں سے شور و شرابہ کی بآواز بلند

صدائیں آ رہی تھیں۔ آوازیں کچھ یوں تھیں؛ 'مر جائیں، ہاتھ ٹوٹ جائیں، اللہ غارت کرے جس نے مجھ غریب بڑھیا پر یہ جادو کی ہنڈیا کا وار کیا ہے۔' آوازیں تھیں کہ تھم ہی نہیں رہی تھیں اور ساتھ ساتھ اچھا خاصا مجمع بھی جمع ہو رہا تھا۔ تقریباً سارے ہی محلہ دار اس گھر کے پچھواڑے میں جمع تھے اور محوِ سوچ و بچار تھے۔ سامنے ہی وہ پُر اسرار چیز تھی جس کے بارے میں جناب مقبول رضا جعفری (مرحوم) کی والدہ پُر اسرار باتیں کر رہی تھیں اور ساتھ ہی اس کے ممکنہ مالک کو صلواتیں سنا رہی تھیں۔ ہم بھائی لوگ بھی شور و شرابہ کو سن کر ادھر لپکے اور جیسے ہی اس پُر اسرار شے پر نظر پڑی، میرے بڑے بھائی الیاس قریشی فوراً بولے۔ 'وہ رہا ہمارا پریشر ککر، تو یہ یہاں گرا ہے۔' اس نے فوراً پریشر ککر کو اٹھایا اور گھر سے باہر لے آیا لیکن اماں جی آڑے آ گئیں اور کہنے لگیں، 'تو یہ تم لوگوں کی کارستانی ہے۔ تم نے مجھے ہلاک کرنے کے لیے یہ ہنڈیا چلائی ہے۔' الیاس بھائی بولے، 'اماں جی مجھے اور تو کچھ علم نہیں کہ جادو کی ہنڈیا کیا ہوتی ہے بس اس کا پتا ہے کہ یہ ہمارا پریشر ککر ہے اور آج ہماری والدہ نے ثابت مونگ گوشت کا سالن بنانا تھا اور یہ چولہے پر رکھا ہوا تھا کہ اچانک غائب ہو گیا اور یہ دیکھیں۔' اس نے جب ڈھکنا کھولا تو مونگ کی دال کے لڈو بنے ہوئے تھے اور بالکل خشک کیوں کہ سارا پانی تو بھاپ بن گیا اور ڈھکنے کی نوزل سے نکل گیا باقی دال کے دانے آپس میں لڈوؤں کی طرح جڑ گئے۔

لیکن بات اتنی آسانی سے سمجھ آنے والی نہیں تھی۔ اماں بی تو متفق نہ

ہوئیں اور بعد میں بھی یہی الزام لگاتی رہیں کہ مجھ پر انھوں نے جادو کی ہنڈیا کا وار کیا ہے لیکن وہاں کچھ اہل عقل لوگ بھی موجود تھے جو ساری حقیقت جلد سمجھ گئے اور بھاپ کی طاقت کے فلسفہ کو دوسروں کو سمجھانے لگے۔

ہوا کچھ یوں کہ ڈھکنے کی نوزل میں ایک ثابت مونگ پھنس گیا جس نے ویٹ کو بے عمل کر دیا اور بھاپ اندر ہی اندر جمع ہونے لگی۔ بھاپ اتنی جمع ہو گئی کہ خدانخواستہ اگر ککر کمتر معیار کا ہوتا تو وہیں پھٹ جاتا اور زیادہ نقصان کرتا لیکن اللہ تعالیٰ کو یوں منظور ہوا کہ بھاپ کا پریشر اوپر نوزل کی طرف ہی رہا اور مونگ کا دانہ اس پریشر کی وجہ سے جیسے ہی راستے سے ہٹا تو پورے کا پورا پریشر ککر پہلے گھوما اور پھر گھومتے ہی اوپر کی طرف اٹھا اور بالکل عمودی پرواز کر گیا۔ اور جیسے جیسے بھاپ کا پریشر کم ہوتا گیا اس کی بلندی کم اور پروجیکٹائل حرکت زیادہ ہوتی رہی اور بالآخر وہ ساتھ والوں کے گھر کے صحن جو گلی کی طرف تھا وہاں گر گیا۔

## جعلی عامل

جعلی عاملوں کے بارے میں بہت دفعہ سنا اور پڑھا کہ کس کس طور یہ لوگ سادہ لوح لوگوں اور خاص طور پر غریب اور کم پڑھے لکھے لوگوں کو اپنے جال میں پھنساتے ہیں اور ان کا بے تحاشا استحصال کرتے ہیں، ان سے مال بٹورتے ہیں۔ لیکن اچھے خاصے پڑھے لکھے اور باشعور لوگ بھی ان کے جال میں اس طرح پھنستے ہیں کہ ان پڑھ اور پڑھے لکھے لوگوں میں تمیز کرنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔

ایسا ہی ایک واقعہ بلکہ دو ایک واقعات میری فیملی، میرے نزدیکی ملنے والوں اور محلے داروں کے ساتھ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی اگر خاص رحمت اور نصرت نہ ہوتی تو میں بھی ایسے ہی واقعات کی لڑی کا ایک حصہ ہوتا اور لوگ مزے لے لے کر یہ واقعہ دوسرے لوگوں کو سناتے۔

ہوا یوں کہ ایک دفعہ میں تقریباً ایک ماہ سے زائد عرصہ فیلڈ کیمپ جو میرا خیال ہے چکوال میں لگا ہوا تھا، رہنے کے بعد گھر لاہور آیا۔ ایک ماہ کے انتھک فیلڈ ورک اور سفر کی صعوبتیں سہہ کر جب لاہور اپنے گھر پہنچا تو عجیب سحر زدہ ماحول کو محسوس کیا۔ گھر میں آٹھ دس نفوس کے ہوتے ہوئے ایک پر اسرار خاموشی طاری ہوئی ہوئی تھی جو ہمارے گھر کے عمومی ماحول سے ہر گز مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ میں کافی حیران تھا کہ والدہ محترمہ بھی اپنی مخصوص جگہ تخت پوش پر تشریف فرما نہیں ہیں اور گھر کی باقی خواتین بھی بشمول میری اہلیہ کے بڑے سہمے ہوئے انداز میں خاموشی سے اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ ابھی حالات کو سمجھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا محمد بلال قریشی (میرا بڑا بیٹا) بولا؛ پاپا دادی اماں ڈرائنگ روم میں ہیں اور کوئی بندہ داڑھی والا ہے، اس سے باتیں کر رہی ہیں۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ یا اللہ خیر ہو۔ دل ہی دل میں وسوسات اور اللہ کی مدد کے تصورات لیے میں نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا اور سامنے ہی ایک مخصوص تراشیدہ داڑھی والے جو کہ خضاب سے کالی کی گئی تھی اور متاثر کن لباس بمعہ تیز خوشبویات اور خاص قسم کا

رومال سر پر ڈالے ہوئے ایک شخص پر نظر پڑی۔ والدہ محترمہ ڈرائنگ روم سے متصل دروازے کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں اور اس شخص کی باتیں سحر زدہ ہو کر سن رہی تھیں۔ میری آنکھیں جب اس شخص کی آنکھوں سے متصادم ہوئیں تو بے ساختہ میں نے السلام علیکم کے الفاظ ادا کیے۔ وعلیکم السلام کے جواب کے ساتھ ہی ہلکا سا تعارف بھی ہو گیا اور علم ہوا کہ موصوف کچھ خاص پہنچے ہوئے عامل ہیں اور اپنے علم کی بدولت کئی بدمعاش شیطان نما جن قابو کر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں بڑے سے بڑے کالے علم کا توڑ اور ہر قسم کے سفلی عملیات کا مقابلہ بخوبی سرانجام پا چکے ہیں۔

'یہ میرا بیٹا عباس ہے جو ابھی ابھی سفر سے لوٹا ہے۔' میری والدہ کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی انھوں نے اس ماہر عملیات کا تفصیلی تعارف بھی کروایا۔

اب صورت احوال یہ تھی کہ سحر زدہ ماحول اور پراسرار خاموشی، پھر اس شخص کی شکل، اوپر سے عجیب وضع قطع سب کچھ پہلے ہی مجھے سمجھا چکی تھیں کہ کس قسم کے معاملات اور واقعات آگے پیش رو ہیں۔ رہی سہی کسر والدہ محترمہ کے تعارف نے پوری کر دی۔ آگے کا حال بیان کرنے سے پہلے والدہ کی اس وقت کی طبیعت و صحت کے بارے میں آگاہ کرنا ضروری ہے۔ والدہ کو 2003 میں سانس کی بیماری کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس بیماری میں سانس لینے کے بعد اخراجی گیس جو کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ ہوتی ہے اس کا مسئلہ درپیش ہو گیا تھا۔ انھوں نے جس بہادری

سے اس بیماری کا مقابلہ کیا تھا وہ اپنی مثال آپ ہے لیکن کچھ ضعیف العقیدہ عورتوں نے والدہ کے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ آپ کو ہو سکتا ہے کسی عمل کے ذریعے کوئی تنگ کر رہا ہے لہٰذا کسی مستند عامل سے بات کر لینا چاہیے اور اس کو دکھا لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لہٰذا میری والدہ محترمہ نے بڑی تگ و دو کے بعد ان عامل صاحب کے ساتھ رابطہ کیا اور آج یہ عامل صاحب والدہ محترمہ پر کوئی ممکنہ جادو یا سحر کو دریافت کرنے اور اس کا توڑ کرنے کے لیے تشریف فرما تھے۔

اب عامل صاحب نے اپنی دھاک بٹھانے کے لیے میرے ساتھ جو گفتگو کی وہ ان کی پروفیشنل لائف یا سمجھ لیں پیشہ ور کاروبار کی انتہا کو چھوتی ہوئی گفتگو تھی۔ اللہ تعالیٰ نے میرے ذہن میں فوراً اس شخص کی جعل سازی اور ملمع کاری کو واضح کر دیا اور مجھے سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ جعلی عامل اور اس کی واردات آج میرے ہی گھر میں ہونے کو ہے۔ ساتھ ساتھ اللہ نے ذہن میں یہ بھی ڈال دیا کہ انتہائی محتاط اور نپے تلے انداز میں اس شخص اور اس کی واردات کا نہ صرف مقابلہ کرنا ہے بلکہ اس کے ساتھ اس انداز سے معاملہ کرنا ہے کہ یہ دوبارہ یہاں نہ آئے اور میری غیر موجودگی میں میرے گھر والوں کو کسی قسم کی پریشانی سے دوچار نہ کرے۔ لہٰذا میں چپ چاپ ایک فرمانبردار اور متاثر شخص کی مانند اس کی باتیں سنتا جا رہا تھا اور اس کو یقین دلا رہا تھا کہ میں بھی اس کا شکار ہو چکا ہوں۔

اب عامل صاحب نے اس بات کا برملا اعلان کر دیا کہ آپ کی والدہ پر کوئی

سخت قسم کا سفلی علم ہوا ہے اور اس کا وجود اور توڑ دونوں آپ کے سامنے کرنے کے لیے آپ کو میرے ساتھ تعاون کرنا ہو گا۔

چنانچہ عامل صاحب کے پلان کے مطابق عمل شروع کیا گیا اور جیسے جیسے عامل صاحب فرمائیں ویسے ویسے میں ایک تابعدار چھوٹو کی طرح ان کے ہر حکم کی پیروی کرنے لگا۔

سب سے پہلے انھوں نے صاف اور خشک مٹی کا تقاضا کیا جو میں نے ادھر ہی گھر کے باہر کیاری سے کھرپے کی مدد سے حاصل کی اور ان کے حوالے کی۔ اب وہ فرمانے لگے کہ اس مٹی کو اچھی طرح مسلنا ہے اور جو بھی اس میں سخت ڈھیلے ہیں یا کنکر ہیں وہ نکالنے ہیں۔ مٹی کو اچھی طرح اس طرح بنانا ہے جس طرح پسا ہوا آٹا ہوتا ہے۔ میں نے ایسے ہی کیا اور ساتھ ساتھ سمجھنے والی صلاحیت استعمال کرتا رہا کہ آخر مٹی اتنی نرم اور صاف کیوں چاہیے۔ ابھی اس راز کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ عامل صاحب نے کہا، مجھے ایک لوٹے میں پانی چاہیے۔ بہتر ہو کہ لوٹا پانی سے بھرا ہو اور پانی ٹھنڈا نہ ہو۔ چنانچہ میں عمل والی جگہ سے دوبارہ گھر کے اندر گیا اور باتھ روم سے پانی کا لوٹا بھر کر باہر عامل صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ ابھی لوٹا پکڑایا ہی تھا کہ عامل صاحب دوبارہ گویا ہوئے، ایک لوٹا پانی کا بھرا ہوا اور چاہیے۔ میں دوبارہ پلٹا اور ایک اور لوٹا بھر کر عامل صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ عامل صاحب نے اسی طرح دو یا تین چکر لگوائے اور ان چکروں میں مَیں ان

کی آنکھ سے اوجھل اور وہ میری آنکھ سے اوجھل رہے۔ لیکن یہ بات یقینی تھی کہ جیسے ہی میں ان کے پاس پانی کالوٹایا کوئی اور برتن لے کر جاتا وہ مٹی کے ساتھ کوئی کارروائی کر رہے ہوتے اور میرے فوراً پہنچتے وقت کچھ گھبراہٹ اور بے چینی کے شکار ہونے لگتے۔ بہر حال یہ تو ان کے پراسرار عمل اور ہمیں سحر زدہ کرنے کے مختلف مراحل تھے۔ جب سارا سٹیج تقریباً تیار ہو گیا تو مجھے بولے کہ والدہ کو بھی اس جگہ لے آئیں۔ چنانچہ میں والدہ کو بمعہ ان کی کرسی کے باہر کیاری کے پاس جہاں یہ عمل ہو رہا تھا، وہاں لے گیا۔

یہ دیکھیں میں نے آپ کے گھر سے ہی مٹی لی ہے اور چونکہ یہ مٹی آپ کے گھر کے اندر سے لی گئی ہے اور ساری چاردیواری کے اندر کا حصہ ہے اور جو بھی سفلی عمل ہوا ہے یا ہوتا ہے چاردیواری میں موجود گھر کے ہر حصے میں اثر رکھتا ہے اس لیے میں نے اپنے علم کے زور پر اس مٹی کے اوپر دھیان مرکوز کر کے آپ کے اوپر ہونے والے سفلی عمل کا ثبوت قید کر لیا ہے جو آپ کے سامنے ہی اس مٹی سے نکلے گا اور پتا چلے گا کہ کس قسم کا جادوٹونہ آپ پر کیا گیا ہے۔

بہر حال اس تقریر کے بعد عامل صاحب نے ایک لوٹا پانی سے بھرا ہوا اٹھایا اور پانی کی دھار تقریباً پانچ یا 6 فٹ کی بلندی سے انتہائی مہارت سے مٹی کے برتن پر ڈالنا شروع کی۔ جیسے ہی پانی مٹی کے برتن میں گرا تو مٹی میں سے بلبلے نکلنا شروع ہو گئے اور ساتھ ہی ہلکا سا دھواں بھی اٹھا۔ دھواں جیسے ہی اٹھا وہ میری

طرف آیا اور اس کی بُو میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور مجھے بچپن یاد آگیا۔ ہم گلی کے بچے بالے شب برات یا معراج شریف والی رات ویلڈر کی دکان سے کیلشیم کاربائیڈ سٹون (ڈبہ پٹاس) کو خرید کر ایک ڈبے میں ڈال کر تھوڑا سا پانی یا لعاب دہن ڈال کر تھوڑی دیر ہلانے کے بعد کسی جلی ہوئی رسی یا کپڑے کو ڈبے کے نیچے موجود چھوٹے سے سوراخ پر رکھتے اور ایک دھماکہ ہوتا اور ڈبے کا اوپر والا ڈھکنا دور جا کر گرتا تو ہماری شب برات کی Activities یا شغل ہمیں خوب مزہ دیتا۔

چنانچہ میں فوراً معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا کہ عامل صاحب نے وہی کیلشیم کاربائیڈ سٹون انتہائی مہارت سے باریک باریک کر کے اس صاف نرم مٹی کے ساتھ اچھی طرح مکس کیا ہے اور یہ ساری کارروائی انھوں نے میرے پانی کے لوٹے لانے اور دوسری اشیاء لانے کے دوران سر انجام دی ہے۔

اب جیسے جیسے پانی مٹی کے ساتھ مل رہا تھا ویسے ویسے کیلشیم کاربائیڈ اور پانی کے درمیان کیمیائی عمل طاقت پکڑ رہا تھا یہاں تک کہ جب ساری کیلشیم کاربائیڈ خرچ ہو گئی، بلبلے نکلنا بند ہو گئے اور عمل میں سے گیس کا اخراج بھی بند ہو گیا تو دوسرا پانی کا لوٹا اٹھایا اور اس جلنے کے عمل کو ٹھنڈا کرنا شروع کیا۔ اسی دوران عامل صاحب نے والدہ کو بتانا شروع کیا کہ دیکھیں، آپ کے گھر کی مٹی کے اوپر بھی اتنا سخت سفلی عمل ہے کہ یہاں اس سفلی عمل کی وجہ سے سخت درجہ حرارت ہے اور اس کو ٹھنڈا کرنے کے لیے جس طرح پانی استعمال کیا گیا ہے ویسے ہی کچھ ایسے

عمل کرنے پڑیں گے کہ سارا سفلی عمل بے کار ہو جائے۔ اب اس سارے کھیل میں مَیں بالکل انجان بنا ہوا تھا، حالانکہ ساری کارروائی ذہن میں آچکی تھی اور اس کا ایک ایک اقدام واضح تھا۔ اب اپنی کارروائی کو مزید پراسرار بنانے کے لیے اسی مٹی کے برتن سے دو عدد زنگ آلود کامن پن نکالیں اور والدہ کو دکھائیں اور ساتھ یہ بھی کہا کہ یہ دیکھیں، یہ جادو کافی دیر سے آپ پر مسلط کیا گیا ہے اور جب تک یہ کامن پن زنگ کی وجہ سے ختم نہیں ہوتیں آپ بیمار رہیں گی، اس لیے ضروری ہے کہ جلد از جلد اس جادو کا توڑ کیا جائے اور آپ صحت مند ہوں۔ اب عامل صاحب اپنے تئیں نسبتاً کامیاب جا رہے تھے۔ ان کے الفاظ اور عملی کام کا اثر والدہ محترمہ پر اثر انداز ہو رہا تھا لہٰذا یہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد وہ تقریباً تقریباً قائل ہو گئیں کہ ان کی بیماری باقاعدہ ایک سفلی عمل کا نتیجہ ہے۔

خیر میں نے ان کی وھیل چیئر اندر ڈرائنگ روم میں لے کر اسی جگہ پر رکھ دی جہاں سے ان کو میں لے کر باہر گیا تھا۔ عامل صاحب بھی اپنی کرسی پر بیٹھ گئے اور داد طلب نگاہوں سے ہمیں دیکھنا شروع کر دیا۔

والدہ نے بات دوبارہ شروع کی اور بولیں: اس طاقت ور سفلی عمل کے توڑ کا کیا طریقہ ہے؟ کیا یہ جادو ختم ہو گا اور میں صحت مند ہو جاؤں گی یا اسی طرح تکلیف میں مبتلا رہوں گی؟

کیوں نہیں اماں جی، ضرور توڑ ہو گا اور آپ بہت جلد صحت مند ہوں گی۔

بس اس کے لیے مجھے چالیس روز کا چلہ کاٹنا ہو گا اور ساتھ ہی سوا تولہ خالص زعفران، ایک عدد لٹھے کا جوڑا اور کچھ جڑی بوٹیوں کے نام لیے کہ یہ چیزیں بھی چاہیے ہوں گی۔ کل ملا کر کوئی 20 ہزار روپے کا نسخہ تھا اور یاد رہے کہ یہ واقعہ سنہ 2000ء کا ہے۔ معاملے کی تہہ تک تو میں پہنچ گیا تھا اور خاموشی سے سارا معاملہ دیکھ اور سن رہا تھا۔ ساتھ ہی اس ڈرامے باز سے خیر و عافیت کے ساتھ جان چھڑانے کے طریقے بھی سوچ رہا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے کچھ اس طرح مدد کی کہ میں بولا، ضرور عامل صاحب ضرور۔ میں آج کل جس پہاڑی علاقے میں کام کر رہا ہوں وہاں یہ تمام اشیاء بآسانی دستیاب ہیں اور زعفران کے وہاں باغ بھی بنائے گئے ہیں لہٰذا میں ایک ہفتے تک واپس اپنے کیمپ میں جاؤں گا اور یہ تمام ضروری اشیاء بمعہ زعفران لے کر آجاؤں گا اور آپ کو پہنچا دوں گا۔ یہ تمام باتیں میں نے جس اعتماد سے کیں وہ عامل صاحب پر اثر کر گئیں اور انھوں نے کہا، بالکل ٹھیک ہے۔ یہ کہہ کر میں نے پرس میں سے 500 روپے نکال کر اس کے ہاتھ پر انتہائی عزت و عاجزی کے ساتھ رکھے اور مزید دینے کا وعدہ کر کے ان کو باہر دروازے تک چھوڑنے گیا۔ 500 روپے کی رقم اور عزت افزائی کام کر گئی اور عامل صاحب اپنی موٹر سائیکل سٹارٹ کر کے روانہ ہو گئے۔

جیسے ہی وہ روانہ ہوئے میں اندر بیٹھک میں آیا اور میری والدہ جو کسی پریشان سوچ میں تھیں، ان کے قدموں میں بیٹھ گیا اور ان کے پیروں کو پکڑ لیا۔

والدہ چونکیں اور بولیں، خیر ہے کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا کہ والدہ یہ عامل شعبدہ باز ہے اور جو کچھ اس نے کیا ہے وہ میں بھی کر سکتا ہوں بلکہ اس سے زیادہ پرکشش طریقے سے کر سکتا ہوں اور ساتھ ہی اس کا عمل جس میں مٹی کو نرم کرنا، پانی کے لوٹے منگوانا اور ڈبہ پٹاس کو مٹی میں مکس کرنا، ہر چیز بتائی اور اس نام نہاد عامل کی دلیری بھی بتائی۔ میری والدہ کو ایسے لگا جیسے وہ جاگ گئی ہوں۔ آنکھوں کی چمک بتارہی تھی کہ والدہ حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہو گئی ہیں اور ان کا رویہ بتارہا تھا کہ وہ اس عامل کی عیاری اور مکاری کی وجہ سے پریشان بھی ہیں، بہر حال والدہ محترمہ سمجھ گئیں اور انھوں نے کہا، بالکل ٹھیک ہے جو تم نے کیا عمدہ کیا، اور ڈھیروں دعائیں بھی دیں۔

## بکرے کی قربانی

میرے ایک نہایت عزیز دوست ہیں محمود صاحب، ان کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ ہوا کہ ان کی اہلیہ کئی ہفتوں سے اپنے ہی گھر میں ڈر اور خوف کا شکار ہو رہی تھیں۔ ڈر خوف کی وجہ وہی تھی جو اکثر خواتین کو ہو جاتی ہے یعنی ڈیپریشن۔ کوئی غیر مرئی مخلوق ان کو نظر آرہی تھی اور اس کی حرکات و سکنات کی وجہ سے محمود صاحب کی اہلیہ بہت زیادہ پریشان تھیں۔ بقول ان کے گھر میں کوئی آسیب آگیا ہے اور یہ گھر اب رہنے کے قابل نہیں اور یہ گھر فوراً تبدیل کر لینا چاہیے۔ اب محمود صاحب بھی ارضیات کے پیشے سے منسلک ہونے کی وجہ سے اکثر پہاڑی

علاقوں میں سروے کے لیے جاتے تھے اور کئی کئی دن بلکہ مہینوں گھر سے باہر رہنے پر مجبور تھے۔ اس لیے اگر گھر میں سکون نہ ہو اور اہل خانہ بے چینی، سراسیمگی اور بے سکونی کی حالت میں ہوں تو جیالوجسٹ حضرات فیلڈ ڈیوٹی صحیح طریقے سے کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ تسلی اور دل جمعی کے ساتھ کام کرنے کے لیے مکمل ذہنی سکون کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ کچھ ایسے ہی حالات تھے جب محمود صاحب نے مجھے اعتماد میں لیتے ہوئے اس پریشانی کا ذکر کیا۔ میں ان دنوں نیا نیا ڈی.جی خان سے آیا تھا اور مجیب الرحمٰن صاحب کے ساتھ رہتے ہوئے غیر مرئی مخلوق والے تجربات میں کسی حد تک آگاہی رکھتا تھا۔ لہٰذا میں نے فوراً محمود صاحب کو کہا، آپ بے فکر ہو جائیں بلکہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے جائیں۔ میں آپ کے گھر کے سارے کمروں میں جاؤں گا اور اگر کوئی ایسی مخلوق واقعی ہوئی تو مجھے کسی نہ کسی طور ہلکی پھلکی آگاہی ہو جائے گی۔ محمود صاحب مان گئے اور مجھے اپنے ساتھ گھر لے آئے۔ یہاں آکر میں باوضو ہوا اور سورۃ یٰسین جو مجھے اللہ کے فضل سے ازبر ہے، آہستہ آہستہ پڑھنے لگا۔ سورہ یٰسین کی تلاوت کرتے کرتے میں نے سارے گھر کا چکر لگایا لیکن مجھے کسی طور پر کوئی بھی اشارہ محسوس نہ ہوا۔ یہاں تک کہ میرے رونگھٹے بھی کھڑے نہ ہوئے۔ سورہ یٰسین کی مکمل تلاوت کے بعد درود ابراہیمی پڑھ کر اور اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد محمود صاحب کی والدہ جو حیات تھیں، ان کے پاس آ بیٹھا اور ان سے کہنے لگا کہ خالہ جی مجھے

نہیں لگتا کہ اس گھر میں خدانخواستہ کوئی آسیب ہے۔ سارا کچھ ٹھیک ہے یا کم از کم مجھے کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ لہٰذا گھر تبدیل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور بھابھی کو کسی اچھے سے ڈاکٹر کو دکھائیں۔ مجھے یقین ہے ان شاء اللہ، اللہ ہر چیز ٹھیک کر دے گا۔ خالہ جی بولیں، اللہ تمھارا بھلا کرے۔ ان شاء اللہ ایسے ہی ہو گا۔ چنانچہ اس دن کے بعد کچھ ہی دن گزرے تھے کہ محمود صاحب دوبارہ پریشان دکھائی دیئے اور کہنے لگے۔ عباس صاحب معاملہ جوں کا توں ہے اور میں جامعہ اشرفیہ میں ایک عامل ہیں، ان کے پاس جارہا ہوں، وہ مسئلہ کا حل بتائیں گے۔

میں اپنی رائے میں بضد رہا کہ محمود صاحب ایسی کوئی بات نہیں ہے، بھابھی ہو سکتا ہے کسی نفسیاتی الجھن کا شکار ہوں اس لیے مناسب ہے کہ کسی ماہر نفسیات سے رابطہ کیا جائے۔ بولے، وہ بھی میں دیکھ رہا ہوں لیکن بیگم اب پہلے سے زیادہ پریشان ہیں اور کہتی ہیں کہ اس مکان سے جلد از جلد چلے جائیں اور کسی اور مکان میں شفٹ ہو جائیں۔ میں فی الحال جامعہ اشرفیہ جارہا ہوں، آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ چنانچہ میں محمود صاحب کی باتوں کی تندی و تیزی محسوس کرتے ہوئے بولا، ٹھیک ہے۔ چلیں میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔

چنانچہ 4 بجے چھٹی کے بعد ہم دونوں جامع اشرفیہ پہنچ گئے اور ان عامل صاحب کے کمرے کا پوچھ کر وہاں دروازہ کھٹکھٹایا۔ تھوڑی دیر انتظار کے بعد عامل صاحب جو 24 سے 25 سال کے نوجوان کالی سیاہ داڑھی اور نہایت سمارٹ جسم

کے مالک تھے، باہر تشریف لائے اور محمود صاحب کو دیکھ کر بولے۔ آیئے اندر تشریف لے آئیں۔

ہم لوگ اندر چلے گئے۔ چارپائی تو نہ تھی بلکہ فرشی گدّا تھا جس کی ایک طرف چھوٹی سی میز جو اکثر تعویز لکھنے کا کام آتی ہے۔ کچھ ان لکھے کاغذ مخصوص سائز کے اور کچھ ایسا سامان جو عامل حضرات اپنے ساتھ رکھتے ہیں، وہ دیکھنے کو ملے۔ میرا ماتھا ٹھنکا اور مشکوک نظروں سے ان عامل صاحب، ان کی حرکات و سکنات اور گفتگو کو پڑھنے لگا۔ کچھ ہی دیر کے بعد مجھے احساس ہوا کہ عامل صاحب خالصتاً پیشہ ور سفلی عمل کا توڑ کرنے والے ہیں اور ویسے ہی جنوں بھوتوں کا علاج کرنے کا ماہرانہ دعویٰ کرنے والے ہیں جیسا کہ ایسے لوگوں کا طریقہ واردات ہوتا ہے۔ لہذا بے چینی سے کچھ دیر وہاں رکا اور جب انھوں نے محمود صاحب کو دوبارہ اکیلے آنے کا کہا تو مجھے یقین ہو گیا کہ عامل صاحب کو میری موجودگی پسند نہیں آئی اور وہ چاہتے ہیں کہ محمود صاحب کے ساتھ تنہائی میں ملاقات کی جائے۔ پھر کچھ دنوں تک محمود صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی اور میں بھی اپنے کاموں میں مصروف رہا اس لیے یہ معاملہ اور اس سے متعلق سنجیدگی ذہن سے ایک طرح سے معطل رہی۔

پھر کچھ یوں ہوا کہ چند روز کے بعد محمود صاحب بالکل تازہ طبیعت کے ساتھ نظر آئے اور جو پہلے کچھ دنوں سے پریشانی کا شکار نظر آ رہے تھے، وہ

سرے سے غائب نظر آئی اور بالکل ہشاش بشاش جیسے کہ پہلے ہوتے تھے، ویسے نظر آئے۔

سلام دعا کے بعد میں نے چھوٹتے ہی پوچھا کہ گھر کا اور گھر والوں کا کیا حال ہے؟ بولے؛ الحمدللہ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ مجھے کچھ معاملہ مشکوک لگا۔ میں نے پوچھا کہ محمود صاحب آپ دوبارہ اس عامل کے پاس گئے تھے؟ اور کیا اس کے مطالبات پورے کر دیے؟ محمود صاحب کی ایک بہت بڑی خوبی ہے کہ جھوٹ نہیں بولتے اور نہ ہی بات کو ٹالتے ہیں اس لیے فوراً جواب دیا، ہاں میں گیا تھا اور ان کے مطالبات بھی پورے کر دیے اور اس کام میں اس زمانے کے حساب سے اچھی خاصی رقم صرف ہو گئی۔ اب گھر والے ٹھیک ہیں اور انھیں کسی قسم کا وہم یا تکلیف دہ خیال نہیں آرہا (بقول محمود صاحب کے عامل نے ایک عدد دیسی بکرا ذبح کرنے کا کہا تھا جو محمود صاحب نے پورا کر دیا تھا)۔ میں نے خوشی کا اظہار کیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔

## پہاڑی گھوڑے

اپنے پیشہ کے لحاظ سے چونکہ جیالوجیسٹ (ماہر ارضیات) کا شعبہ ماتھے پر جھومر کی طرح سجا ہوا تھا اس لیے اپنے وطن عزیز میں جہاں 60-65٪ پہاڑی علاقہ ہے اور خوبصورت چٹانوں سے مزین ہے جگہ جگہ جانے اور ارضیاتی سروے کرنے کا موقع ملتا رہا۔ اسی ارضیاتی سروے میں مختلف پہاڑی نمونہ جات اکٹھے کرنا

سروے کا حصہ ہے۔ اس سے بعض اوقات ایسی ایسی دور دراز واقع جگہوں پر جانے کا اتفاق ہوا کہ سمجھیں نہ تو وہاں چرند پرند اور درند ہیں اور نہ ہی انسان لیکن پھر بھی یہ علاقے اپنے اپنے حساب سے ایسی عجیب وغریب دنیا اور واقعات ذخیرہ کیے ہوئے ہیں کہ انسانی عقل بے بس ہو جاتی ہے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے؟

ایسا ہی ایک ارضیاتی سروے جہاں ہماری ٹیم میں میرے علاوہ سینیئر سائنسدان اور جونیئر سائنسدان سبھی شامل تھے، خطہ پوٹھوہار ضلع چکوال نزد خان پور میں واقع ایک جگہ پیر کند المعروف بابانور شاہ غازی میں کام کر رہے تھے۔ اس جگہ زمین کا بالائی حصہ کسی ارضیاتی عمل کی وجہ سے ٹوٹا اور ایک ارضیاتی اصطلاحی نام جسے ہم فالٹ کہتے ہیں معرضِ وجود میں آگیا۔ یہ فالٹ دل جبہ فالٹ آف شوٹ جہلم فالٹ کے نام سے ارضیاتی اصطلاح میں جانا جاتا ہے۔ اس فالٹ کے نتیجہ میں سالٹ رینج کے زیرِ زمین پانی جس میں نمک اور گندھک والے بیڈ (bed) ہیں زمین کی بالائی سطح سے ذرا نیچے تک موجود ہیں۔ وہاں ان کی موجودگی اور پانی (water table) کی زیرِزمین موجودگی گندھک اور نمکین پانی کے ذخیرہ میں بدل چکی ہے اور چونکہ دل جبہ فالٹ کے ساتھ ساتھ کافی دراڑیں آف شوٹ کی شکل میں موجود ہیں اس لیے ان میں سے چند ایک کے ذریعے چشمہ کی شکل میں پانی کی آمد ہو رہی ہے۔ یہاں پر ایک بات بہت مشہور ہے کہ اگر کسی کو پیٹ کا کوئی مسئلہ درپیش ہو قبض خاص طور پر یا کوئی بھی بیماری جس کا مرض معدہ اور پیٹ کے امراض سے جڑا ہو وہ یہاں آکر خوب دبا کر پانی پیئے کچھ دیر رکا رہے تو

اُسے کچھ دیر میں جلاب آئے گا جس کی وجہ سے پیچش لگیں گے اور پیٹ میں مروڑ اٹھے گا۔ بار بار رفع حاجت کرے گا تو گھنٹوں کے بعد بالکل ٹھیک ہو جائے گا اور کوئی بیماری نہیں رہے گی۔

یہی وجہ تھی کہ وہاں جابجا اِنسانی فضلہ نظر آرہا تھا اور ایسے تھا جیسے گائے بھینس کے گوبر کو ایندھن کی طرح استعمال کرنے کے لیے چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں بنائی جاتی ہیں۔ بہر حال یہ کارروائی سننے اور دیکھنے کے بعد ہم چشمہ سے نیچے اتر گئے۔ ذرا آگے دل جبہ فالٹ کے پاس جا کر اُس کے نوٹس لیتے لیتے رُک گئے۔

وہاں ایک عجیب منظر تھا ایک شخص جس نے سبز رنگ کی ٹوپی اور سبز رنگ کا ہی جبہ پہنے ہوئے تھا وہاں بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا جھنڈا بھی تھا۔ وہ شخص وہاں پر ایک بڑے سے دراڑ (فریکچر) کے منہ کے پاس بیٹھا تھا اور ساتھ ہی اس نے ایک کپڑا بھی بچھایا ہوا تھا جس میں کاغذی اور دھاتی کرنسی پڑی ہوئی نظر آرہی تھی۔ یہ مجاور ٹائپ آدمی آپ کو ہر علاقہ میں اپنی مخصوص صورت اور حلیے کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ بہر حال فیلڈ ورک کی تھکاوٹ کو دور کرنے کے لیے ہم اُس کے پاس گئے تو پوچھا یہاں کیا کر رہے ہو؟ تو بولا پیر صاحب کا انتظار کر رہا ہوں جو اس دراڑ میں گئے ہوئے ہیں اور ابھی تک باہر نہیں آئے۔ اب ہم نوجوان سائنس دانوں کی رگِ شرارت جاگی اور ہم نے اُس سے سوالات شروع کر دیے کہ پیر صاحب کیسے اندر گئے اور پیر صاحب کہاں سے کس سواری پر سوار ہو کر آئے اور تم ان کے کیا لگتے ہو وغیرہ وغیرہ۔ اب جو کہانی اُس مجاور نے سنائی وہ

کچھ اِس طرح ہے کہ میرے پیر صاحب نہایت شریف اور بھولے بھالے ہیں۔ یہ اپنے بھائیوں کے ساتھ کشمیر میں رہ رہے تھے کہ وہاں سے نکلنا پڑ گیا۔ دوسرے بھائیوں کے پاس گھوڑے اور دوسری سواریاں تھیں اس لیے وہ نکل گئے۔ پیر صاحب جس پہاڑ پر بیٹھے تھے وہ ایک بالکل عمودی دیوار کی طرح پہاڑی حصہ تھا (فالٹ) اور اس پر جیسے گھوڑے کی کاٹھی پر گھڑ سوار بیٹھتا ہے یعنی ایک ٹانگ اِدھر دوسری ٹانگ اُدھر۔ اِسی طرح پیر صاحب نے اُس دیوار کو گھوڑے کی پشت سمجھا ہوا تھا کہ جب کہنے والے نے کہا کہ آپ کے بھائی اور دوسرے لوگ اپنے اپنے گھوڑوں پر نکل گئے ہیں تو آپ کیسے جائیں گے؟ تو کمال روحانی موڈ میں پیر صاحب بولے، یہ پہاڑ جس پر میں بیٹھا ہوں یہی میرا گھوڑا ہے یہ مُجھے یہاں سے لے جائے گا اور ساتھ ہی گھوڑے کی طرح اُس دیوار کو ایڑ لگائی اور وہ پہاڑ گھوڑے کی طرح بھاگتا ہوا یہاں تک آیا۔ یہ جو پہاڑی دیوار ہے (پیر کند) یعنی پیر صاحب کی دیوار یہ وہی تو ہے جس پر پیر صاحب آئے اور اندر ستانے کے لیے تشریف لے گئے۔ آپ کو اگر کوئی کسی قسم کی ضرورت ہے کوئی مسئلہ درپیش ہے، کوئی روحانی، جسمانی، ذہنی یا مالی مشکلات ہیں اور آپ اُس کا علاج چاہتے ہیں تو یہاں نذرانہ رکھیں اور دل میں دعا مانگیں تو آپ کی دلی مراد پوری ہو جائے گی۔ ہم سمجھ گئے کہ اِس مجاور نے یہاں بھی دکان کھولی ہوئی ہے اور پیٹ کا علاج کروانے والے یہاں پر آکر اِس کے پیٹ کا بھی کچھ بندوبست کرتے ہیں۔

دوسرا پہاڑی گھوڑا گلگت بلتستان میں واقعہ دریائے ہنزہ کے مشرقی

کنارے سے تقریباً 20 کلومیٹر پر واقع ہے۔ یہ گھوڑا دراصل راکاپوشی پہاڑ ہے۔ جو گلگت شہر سے KKH روڈ کے ساتھ تقریباً ایک سو (100) کلومیٹر اپ سٹریم بطرف ہنزہ شہر واقع ہے۔ راکاپوشی کی انفرادیت یہ ہے کہ سارا سال برف سے ڈھکا رہتا ہے۔ اور قراقرم رینج کا اس ایریا میں اکلوتا پہاڑ ہے یعنی اتنی بلندی پر ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ اور بلندی والے پہاڑ نہیں ہیں۔ یہ غالباً دنیا بھر کے اونچی بلندی رکھنے والے پہاڑوں میں 27 نمبر پر آتا ہے۔ بہرحال ایک رات جو تھی بھی چودھویں یا پورے چاند کی راتوں میں سے ایک مجھے نومل سے علی آباد جانے کی ضرورت پیش آئی تو جب تک وادی تنگ رہی اور ہماری گاڑی کی ڈرائیونگ والی سائیڈ دائیں طرف پر واقع پہاڑ کی اوٹ میں رہی تب تک تو کچھ خاص یا قابلِ ذکر معاملہ نہ تھا لیکن جیسے ہی سڑک کے ساتھ ساتھ گاڑی دائیں طرف مڑی اور وادی ذرا کھل گئی تو یکا یک سامنے ایک سفید رنگ کا چاند کی چاندنی میں مکمل ڈوبا ہوا دیو ہیکل پہاڑ سامنے آ گیا۔ میں واقعی ڈر گیا کہ یہ کیا چیز ہے، اتنی چمک و دمک تھی اُس پہاڑ میں کہ میں اپنی آنکھیں ذرا دیر کھلی نہ رکھ سکتا تھا۔ شاید مسلسل اندھیرے میں رہنے کی وجہ سے اچانک اتنی روشنی میں ڈوبا ہوا دیو ہیکل سراپا جو اچانک ہی سامنے آ موجود ہوا۔ اس لیے بھی بہرحال یہ میری فیلڈ لائف کے چند ناقابل فراموش نظاروں میں سے ایک نظارہ تھا جو مجھے مبہوت کر گیا۔ میں نے ڈرائیور کو کہا گاڑی روکو اور اِس نظارے کو خوب خوب آنکھوں میں سمونے دو۔ یہ غالباً 2010 کا واقعہ تھا کہ جیب میں کوئی کیمرہ یا کیمرہ نما موبائل بھی نہ تھا کہ فوٹو بنا

لی جاتی لیکن نظارہ ایسا تھا کہ کافی دِنوں تک میں اِس کے مزے لیتا رہا۔

پھر کچھ دِنوں کے بعد میں اور دوسرے فیلڈ کولیگ دِن کے وقت دوبارہ راکاپوشی پہاڑ کی طرف گئے تو وہیں موڑ پر جب گاڑی سیدھی ہوئی تو سفید چادر لیے دیو ہیکل پہاڑ (راکاپوشی) سے ملاقات ہوئی۔ اب کی بار طبیعت میں کوئی خاص تغیر نہ آیا کیونکہ دن کا وقت تھا اور ویسے بھی دوسری ملاقات تھی لیکن پہاڑ کی سفیدی نے پھر بھی کچھ نہ کچھ متاثر ضرور کیا۔

گاڑی راکاپوشی کے نزدیک بنے ہوئے ایک ہوٹل پر کھڑی کی اور راکاپوشی پہاڑ کا نزدیکی جائزہ لینے کے لیے اس کی طرف منہ کر کے چلنا شروع کر دیا۔ جوں جوں نزدیک جاتے تُوں تُوں اُس کی خوبصورتی دِل کو چھونے لگتی۔ بہرحال اتنا پیدل جانے کا وقت نہ تھا اس لیے صرف ایک آدھ کلومیٹر کے بعد واپس آنا شروع ہو گئے۔ واپسی پر وہاں کچھ جاپانیوں سے ملاقات ہو گئی۔ پہلے پہل تو حیرانگی ہوئی کہ آج کل ملک کے سیکیورٹی کے حالات ٹھیک نہیں ہیں اور ٹورازم اس وجہ سے تقریباً بند ہوا ہوا ہے تو یہ جاپانی سیاح یہاں پر کیا کر رہے ہیں۔ ہائے ہیلو کے بعد جب ان سے تعارف ہوا اور اپنا پیشہ ماہرِ ارضیات کے طور پر بتایا تو کچھ دیر کے بعد ہم گھل مل گئے۔ پہلے پہل تو راکاپوشی اور ارد گرد کے علاقے کی خوبصورتی سے متاثرہ گفتگو کرتے رہے اور ہم لوگ ان کے ملک کی کی گئی ترقی کو سراہتے رہے لیکن بعد میں جب اُن کے راکاپوشی پہاڑ کے ساتھ کچھ غیر معمولی تعلق اور عقیدت کے بارے میں جانکاری ہوئی تو نہایت تجسس ہوا کہ اتنی

عقیدت وہ بھی ایک پہاڑ کے ساتھ اور ایک انتہائی ترقی یافتہ تعلیم یافتہ اور جرأت والی قوم کی تو مجھ سے رہا نہ گیا کہ وجہ پوچھوں کہ آپ کو راکاپوشی سے اتنی محبت اور عقیدت کیوں ہے تو جواب ملاحظہ فرمائیں کہ ان کا جواب کیا تھا۔ ان کے ایک لیڈر نے کہا کہ دراصل راکاپوشی صرف پہاڑ نہیں ہے بلکہ یہ ایک تیز رفتار اور مضبوط سواری ہے یعنی گھوڑا ہے اور اِس گھوڑے پر سوار ہو کر اُن کے اوتار یا دیوتا جو بھی سمجھ لیں یہاں پر آئے تھے اور بعد ازاں یہیں پر کسی خاص مقصد کے لیے رکے ہوئے ہیں۔ جیسے ہی ان کا کام مکمل ہو گا وہ اِسی گھوڑے پر بیٹھ کر دوبارہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔

اس کا جواب مجھے کئی معاملات سمجھا گیا۔ پہلی بات تو یہ کہ عقیدت یا سوچ چاہے ہم جیسی ناخواندہ قوموں کی ہو یا پڑھی لکھی قوموں کی، بہت مضبوط ہوتی ہے اور آسانی کے ساتھ اس سے پیچھا نہیں چھڑایا جا سکتا۔ دوسرا اللہ تبارک و تعالیٰ پر بہت پیار اور محبت نچھاور کرنے کو دل چاہا جس نے ہمیں ان تمام فرسودہ، ناقابلِ فہم اور بد عقیدہ زندگی کے اندھیروں سے محفوظ رکھ کر دینِ اسلام کی روشنی سے بہرہ ور کیا۔

اسی طرح بد عقیدہ زندگی اور دورِ جاہلیت سے جڑی ہوئی مثال چین کے شہر گوازنگو کے شمال کی طرف موجود ایک شہر شوگوان میں ہے جو تقریباً 250 کلومیٹر کی مسافت پر ہے۔ وہاں پر Danxi-Shan نیشنل پارک ہے جس میں موجود چٹانیں نہایت نرم لتھالوجی رکھتی ہیں۔ اس نرم لتھالوجی کی وجہ سے چٹانوں

کی ٹوٹ پھوٹ کا عمل بہت تیزی سے اور آسانی سے ہو جاتا ہے۔ چونکہ اس پارک میں جسے ورلڈ جیالوجیکل میوزیم کا نام دیا گیا ہے پانی کے جوہڑوں اور چھوٹی چھوٹی ندیوں کی بہتات ہے، جو شاید زیادہ بارشوں کی وجہ سے ہو سکتی ہے' یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ یہاں ہواؤں اور بارشوں نے اس علاقے کی چٹانوں میں ٹوٹ پھوٹ کے عمل میں زیادہ حصہ لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میوزیم میں جگہ جگہ آپ کو سرسبز درخت اور جنگل بھی ملیں گے اور ساتھ ساتھ چٹانیں عجیب و غریب روپ دھارتی نظر آئیں گی۔ اس ارضیاتی ٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے چٹانوں نے ایسی ایسی اشکال اختیار کی ہیں کہ یوں گمان ہوتا ہے جیسے کسی مجسمہ ساز نے باقاعدہ بہت ریاضت سے چٹانوں کو تراش خراش کر کے یہ شاہکار تیار کیے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ پہاڑوں کی تراش خراش ایسی ہوئی ہے کہ صاف لگتا ہے جیسے کوئی عورت چِت لیٹی ہو۔ اس پہاڑی کو سوئی ہوئی خوبصورتی (sleeping beauty) کا نام دیا گیا ہے۔ ایک اور جگہ آپ کو ندی ایسی ملے گی جیسے بہت بڑے سانپ کی گزرگاہ ہو اور مختلف جھیلیں اس طرح آپس میں جڑی ہوتی ہیں کہ دور سے لگتا ہے جیسے خوفناک بلا 'ڈریگن' ہو۔ ایک مقام پر نسوانی پتھر اور ایک دوسرے مقام پر مردانہ پتھر واضح نظر آئیں گے۔ یہ پارک واقعی اپنی حیرت انگیز جیالوجی اور قدرتی شاہکار کا حامل ہونے کی بنا پر ورلڈ جیولوجیکل میوزیم کا درجہ رکھتا ہے۔

ایک جگہ جہاں مردانہ پتھر (Male stone) نظر آتا ہے وہیں پر ایک جھیل بھی واقع ہے۔ جب سورج ڈھلتا ہے تو اِس مردانہ پتھر کا سایہ، جو تقریباً سو

ڈیڑھ سو فٹ بلند ہے، پوری آب و تاب کے ساتھ جھیل کے پانی پر پڑتا ہے۔ ہمارے انٹرپریٹر (مترجم) غالباً مسٹر لی نام تھا اُن کا، انھوں نے بڑی عجیب وغریب بات بتائی کہ یہاں پر مقامی اور غیر مقامی دونوں لوگ اچھی خاصی تعداد میں جھیل کے اس حصے کا پانی اپنے برتنوں یا کولر میں بھر لیتے ہیں جس پر اِس سٹیچو کا سایہ پڑتا ہے۔ وجہ اُس کی یہ ہے کہ ان کو اِس بات کا یقین ہے کہ پانی کے جس حصہ پر اس مردانہ پتھر کے حامل سٹیچو کا سایہ پڑتا ہے اگر اس پانی کو پی لیں خاص طور پر عورتیں تو ان کے جو بچہ پیدا ہو گا وہ لڑکا ہو گا۔ یہ بات سن کر مجھے اندرون سندھ (پاکستان) کے کئی ایسے مقامات یاد آ گئے جہاں پر اس قسم کی واہیات اور توہم پرستی سے جڑی کئی باتیں ہیں۔

## اونٹ کا کینہ

ایک بین الاقوامی سروے کے مطابق جو مختلف ذرائع سے کیا گیا، وطنِ عزیز پاکستان پہلے دس ممالک کی لسٹ میں آتا ہے جو اونٹ کی پاپولیشن میں نمایاں ہیں۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اِس لسٹ کے مطابق سعودی عرب کا نمبر کافی نیچے ہے۔ ویسے تو اونٹ وطنِ عزیز کے ہر صوبے میں موجود ہے لیکن صوبہ پنجاب اور سندھ میں اِن کی تعداد زیادہ ہے اور اگر پنجاب کے مختلف نمایاں علاقہ جات دیکھے جائیں تو جنوبی پنجاب خاص طور پر ملتان سے جنوب کی طرف ڈیرہ غازی خان، راجن پور اضلاع میں اونٹ بھرپور تعداد میں موجود ہیں۔ ایک اور سروے کے مطابق پاکستان میں اس وقت اونٹوں کی تعداد ایک کروڑ سے بھی

متجاوز ہے۔

اونٹ ہاتھی کی طرح بہت کینہ پرور جانور ہے۔ یہ غصہ کی حالت میں بپھر جاتا ہے اور کافی دیر کے بعد نارمل ہوتا ہے۔ چند ایک مثالیں کچھ چشم دید اور چند ایک معتبر شخصیات بیان کردہ قابلِ توجہ ہیں۔

ڈاکٹر خورشید صاحب مرحوم کوٹ مٹھن میں رہائش پذیر رہے ہیں اور ہمارے ایک کولیگ طاہر عابد مرحوم کے سسر بھی رہے ہیں۔ اپنے علاقے کی ایک نامور شخصیت اور کسی زمانہ میں جماعتِ اسلامی کی طرف سے MPA بھی رہ چکے تھے۔ اس واقعہ کو انھی کی زبانی آگے چل کر بیان کرتا ہوں۔ ہوا یوں کہ اندازاً 1996 میں مَیں اور طاہر عابد مرحوم اپنے مینیجر محمد شفیق اکرم مرحوم اور ڈاکٹر خورشید مرحوم کے ہمراہ راجن پور کے مڈ ٹیرس کو عبور کر کے ایک گاؤں کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں اونٹوں کا ایک بہت بڑا ریوڑ دیکھنے کو ملا۔ عجب اتفاق یہ تھا کہ یہ ریوڑ اسی راستے پر چل رہا تھا جس راستے پر ہماری جیپ تھی اور باوجود چند ایک بار ہارن دینے کے بھی راستہ صاف نہیں ہو رہا تھا۔ اِس دوران ڈرائیور نے بڑی کوشش کی کہ ہارن کی آواز سے اونٹ راستہ چھوڑ دیں لیکن اونٹ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بالآخر ڈاکٹر خورشید صاحب نے ڈرائیور کو مزید ہارن دینے سے منع کر دیا اور مشورہ دیا کہ راستے سے ہٹ کر گاڑی کو نکال لے۔ چناچہ ڈرائیور نے ڈاکٹر خورشید صاحب کے مشورے پر عمل کیا اور اونٹوں کے ریوڑ کو بائی پاس کرتے ہوئے دائیں طرف سے گاڑی کو نکال لے گیا۔ اس پوری کاروائی کے رد

عمل کے طور پر ہم سب لوگ مختلف رائے دینے لگے تو ڈاکٹر خورشید صاحب نے اونٹوں کی نفسیات اور کینہ پروری کا واقعہ کچھ یوں سنایا۔ کہ ایک سرخ رنگ کی بالکل نئی مہران سوزوکی گاڑی چند سال بیشتر اِسی علاقہ میں اونٹوں کے ریوڑ کے ساتھ پیچھے پیچھے آرہی تھی کہ مسلسل پیچھے رہنے کی وجہ سے گرد اور سست روئی نے ڈرائیور اور دوسری سواریوں کو مجبور کر دیا کہ وہ راستہ نکالیں اور ریوڑ کو بائی پاس کر کے آگے نکلیں لیکن ریوڑ جو کہ سو سے زیادہ اونٹوں پر مشتمل تھا اِس رعایت کو دینے میں بالکل تیار نہ تھا اور راستہ سے ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔ ڈرائیور بھی بضد ہو گیا کہ ریوڑ کو راستہ دینے پر مجبور کرتا ہوں اور مسلسل ہارن پہ ہارن بجاتا رہا۔ ہارن کی آواز سے اونٹوں کے ریوڑ میں تھوڑی ہل چل مچی جس کا فائدہ ڈرائیور نے اٹھایا اور گاڑی ریوڑ کے اندر گھسا دی۔ ساتھ ہارن بھی بجاتا رہا چنانچہ ہارن اور گاڑی کی سپیڈ کی مدد سے پہلے پہل تو ریوڑ میں گنجائش پیدا کی اور بعد ازاں گاڑی کو نکال لیا۔

بظاہر جس مہارت سے ڈرائیور گاڑی نکالنے میں کامیاب ہوا، ریوڑ بھی پیچھے رہ گیا یہ ایک عام سی بات یا عمل تھا۔ بعد ازاں ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار بڑھائی اور تقریباً 5 یا 7 کلو میٹر کے فاصلے پر جہاں جانا تھا وہاں گاڑی روک لی۔ گاڑی روک کر سوار اور ڈرائیور ایک گھر میں چلے گئے اور گاڑی کو وہیں سڑک پر پارک کر دیا۔

ڈرائیور نے اپنی مہارت اور ہارن سے جو مسلسل بجاتا رہا گاڑی تو نکال لی

لیکن اونٹوں کے ریوڑ کو جس بے چینی اور اضطراب میں مبتلا کیا اُس کا احساس نہ کیا۔ ہارن کی آواز جس طرح اِنسانی مزاج پر اثر انداز ہوتی ہے اِسی طرح جانور پر بھی اثر رکھتی ہے۔ اونٹوں کو اس شور کی آلودگی (noise pollution) کا وجود بے حد ناگوار گزرا۔ انھوں نے راستہ تو دے دیا لیکن جو غصہ، کینہ اور نفرت اُن کے اندر پیدا ہوئی اور بعد میں اُس کا عملی مظاہرہ ان سے سرزد ہوا وہ یقیناً ناقابلِ یقین ہے۔ لیکن چونکہ ڈاکٹر خورشید ایک نامور شخصیت ہونے کے علاوہ صوم و صلوٰۃ کے پابند اور ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق کی بنا پر صادق ٹھہرائے جانے میں کسی قسم کے شک سے مبّرا تھے اس لیے ان کی بات کو یقین کا درجہ دینے میں ہم ذرا بھی Reluctant یا غیر متفق نہیں ہوئے۔

گاڑی کو جو کہ نمایاں رنگ یعنی سرخ رنگ کی تھی پارک چونکہ سڑک پر ہی کر لیا گیا تھا اور آس پاس ہر قسم کی آبادی ندارد تھی اس لیے بغیر کسی ڈر یا چوری کے خوف کے گاڑی سوار اپنے میزبان کے پاس اُس کی حویلی یا گھر کے اندر چلے گئے۔ وہاں تقریباً تین یا چار گھنٹے آرام و طعام کیا اور اندھیرا چھانے کے وقت واپسی کے لیے اپنے میزبان سے اجازت لے کر روانگی کے لیے باہر آئے۔ باہر آکر دیکھا تو گاڑی نظر نہ آئی۔ ڈرائیور کو شک ہوا کہ شاید گاڑی آگے پیچھے پارک ہو گئی تھی اس لیے اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ تلاش شروع کی لیکن گاڑی نہ مِل سکی۔

ایک بات توجہ طلب یہ بنی کہ جہاں گاڑی پارک کی گئی تھی وہاں دھول

اور مٹی اچھی خاصی موجود تھی جو پارکنگ کے وقت نہیں تھی۔ ان سب لوگوں نے ذہن میں یہ بات سوچی کہ اونٹوں کے ریوڑ کے گزرنے سے راستے میں دھول مٹی کی مقدار زیادہ ہوگئی ہوگی لیکن آخر گاڑی کہاں گئی۔ شام کے سائے بھی گہرے ہو رہے تھے۔ معاملے کی سنجیدگی کا احساس ہوتے ہی سب لوگوں کو تشویش ہوئی کہ یہاں تو کوئی قابل ذکر آبادی بھی نہیں اور نہ ہی اتنی آمد و رفت ہے کہ گاڑی کی چوری ہونے کا امکان ہوتا یا کسی اور طرح سے غائب ہونے کا۔ اسی تشویش زدہ حالت میں تلاشِ گاڑی کے دوران ایک شخص کی نظر مٹی سے اَٹے ہوئے سرخ رنگ کے ایک لوہے کے پترے پر پڑی۔ یہ پترا جب مٹی سے نکالا گیا تو علم ہوا کہ یہ گاڑی کی چھت ہے۔ آہستہ آہستہ غم و حیرت کا طوفان دماغوں میں ٹکرانے لگا اور وہ ظاہراً برابر کی سطح تھی لیکن ریت اور مٹی اور وہ بھی نرم جیسے ابھی کسی نے مشین کی مدد سے کھیت کی ploughing کی مانند نئی فصل اُگانے کے لیے نرم کیا ہو۔ اس نرم مٹی سے ایک ٹکڑا لوہے کا جو گاڑی کی چھت تھی بر آمد ہونا تھا کہ اس پورے زمینی قطعہ کو آناً فاناً کھودا گیا تو نیچے گاڑی کے باقی ماندہ حصے جن میں انجن، گاڑی کا فرش کچلے ہوئے ٹائر غرض یہ کہ گاڑی کا پورا وجود لیکن کچلی ہوئی حالت میں۔ یہ بالکل ایسا منظر تھا کہ جیسے گاڑی پر کوئی پہاڑ گر گیا ہو اور جس کے وزن سے تمام گاڑی اس طرح پچک گئی ہو جیسے گنے کا رس نکلنے کے بعد گنے کا پھوک بن جاتا ہے، بالکل زمین کے ساتھ پریس ہوئی۔ یہ سارا منظر اگر ڈاکٹر خورشید صاحب کی زبانی بیان نہ ہوا ہوتا تو بالکل ناقابلِ یقین بلکہ دروغ گوئی

کے زمرے میں آتا ہے لیکن واقعہ اتنا دلچسپ، حیران کن اور بلاشبہ ایک صادق راوی کی زبانی تھا اس لیے یقین کرنے کہ علاوہ کوئی اور راستہ نہیں تھا۔

گاڑی کے اس حشر نشر کے پیچھے اونٹ کا وہی کینہ، غصہ اور عداوت کا مادہ تھا جو اس جانور کی فطرت میں قدرتی طور پر سمایا ہوا ہے۔ اب باقی کی تفصیل کہ اونٹوں کے ریوڑنے گاڑی کی حالت ایسی کیوں کی بہت جلد سمجھ میں آجاتی ہے۔ جب گاڑی اور اس کا ہارن اونٹوں کی سمع خراشی کر کے وہاں سے نکل گئی اور تھوڑی دوری کے بعد ہی نظر آگئی تو اونٹوں نے اپنے غصہ کا اظہار اس پر لاتیں برسا کر کیا۔ پھر ایک دو اونٹوں کی لاتیں تو نہیں چلیں بلکہ سو سے زائد اونٹوں کی لاتیں چلیں اور ان لاتوں نے گاڑی کا کچومر نکال کر رکھ دیا۔ لاتوں کے چلنے کے عمل نے وہاں کی ریت مٹی کا طوفان کھڑا کیا اور بعد میں گاڑی اسی مٹی اور دھول میں دب گئی اور یوں اونٹوں کے کینہ و غصہ کو ٹھنڈک ملی۔

اسی نوعیت کا ایک واقعہ میرے ساتھ بارتھی کے مغرب میں فیلڈ سروے کے دوران پیش آیا۔ جو کچھ یوں تھا کہ وہاں ہم ڈرلنگ آپریشن کے لیے سائیٹ تیار کر رہے تھے۔ سرور ڈوزر آپریٹر اپنے ڈوزر کی مدد سے زمین کو ہموار کر رہا تھا۔ اس لیے نہ صرف اونچی نیچی سطح کو برابر کر رہا تھا بلکہ ساتھ ساتھ چھوٹے موٹے درخت جو کہ زیادہ تر موسمی ہوتے ہیں اکھیڑ رہا تھا۔ اب یہی موسمی درخت یا گھاس پھوس یہاں کے جانوروں خاص طور پر اونٹ نسل کے جانور کے لیے بطور چارہ خوراک استعمال ہوتے ہیں۔ سرور ڈوزر آپریٹر نے بھی

کچھ ایسا کیا کہ وہاں سے کچھ درخت نما چارہ اکھیڑ دیا جو کہ پاس ہی چرتے ہوئے اونٹ کا تھا۔ ابھی یہ مہینہ بھی مارچ کا تھا جو کہ ویسے بھی دودھ والے جانور کے لیے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ بہر حال وجہ کوئی بھی ہو، وہ اونٹ جو بالکل ساتھ ہی چر رہا تھا ناراض ہو گیا اور خوفناک آوازوں کے ساتھ بلبلانا شروع کر دیا۔ اچھی خاصی خوفناک آوازیں تھیں اور انھی آوازوں کے ساتھ وہ باقاعدہ ڈوزر اور آپریٹر دونوں پر حملہ آور ہو گیا۔ میں نے جب سرور کو حواس باختہ ہو کر ڈوزر کو چھوڑ کر بھاگتے دیکھا تو فکر مندی کے عالم میں اس کی طرف دوڑا۔ ساتھ ہی پوچھا کہ کیا معاملہ ہوا ہے، کیوں بھاگ رہے ہو؟ تو اس کی آوازیں کچھ کچھ گھبراہٹ کی حالت میں سنیں اور پھر فوراً اس غصیلے اونٹ پر نظر پڑی جو اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اسی اثنا میں میرا اور سرور کا ساتھ بن گیا اور ہم اکٹھے بھاگنا شروع ہو گئے۔ اب کی بار مسئلہ اور گھمبیر ہو گیا۔ میں اور سرور کبھی اونچائی کی طرف جائیں تاکہ اونٹ رک جائے یا پیچھا چھوڑ دے کبھی نشیب کی طرف اسی بھاگ دوڑ میں پریشانی بڑھ گئی اور میں نے سرور کو کہا کہ سرور تم دوسری طرف بھاگو تاکہ اس کا دھیان بٹے اور یہ ہمارا پیچھا چھوڑے۔ یہ تدبیر کارآمد ثابت ہوئی اور تھوڑی دیر کے لیے وہ رک گیا۔ لیکن پھر سرور کی طرف بھاگا شاید اس نے سرور کو ٹارگٹ کیا تھا کیونکہ اُس نے اُس کی خوراک پر ہاتھ صاف کیا تھا۔ بہر حال چونکہ انسان کی دوڑ اونٹ کی بہ نسبت زیادہ تیز ہے، اس لیے ہم 20 سے 25 منٹ کے بعد غصے سے بھنائے ہوئے اونٹ سے کافی فاصلے پر آ گئے

لیکن اس تھوڑے سے وقفہ نے ہماری ہوش غائب کر دی اور خوف و وحشت کی وجہ سے ہمارے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ بڑی مشکل سے اس آفتِ ناگہانی سے جان چھوٹی لیکن سبق مل گیا کہ کچھ مخصوص موسم، مہینے اور ایام میں اس بظاہر بھولے بھالے جانور سے احتیاط کرنا چاہیے۔

## مردہ زندہ ہو گیا

یہ واقعہ اتنا عجیب و غریب اور اُلجھاؤ والا نہیں ہے جتنا اپنے آغاز سے لے کر اپنے اختتام سے ذرا پہلے تک محسوس ہوتا ہے۔

ہوا یوں کہ ایک دن میں اور میرا ڈرائیور کچھ پہاڑی نمونہ جات کو اکٹھا کرنے کی نیت سے مولی بن کے نزدیک ایک گاؤں میں سنگل کیبن گاڑی لے کر گئے۔ یہ گاؤں ڈیرہ غازی خان سے تقریباً 70 کلومیٹر مغرب کی طرف قبائلی علاقہ راکھی گارج اور نگر نائی کے پاس واقع ہے۔ دور دراز ہونے کی وجہ سے یہاں کے لوگ قریب ترین تحصیل سخی سرور سے اپنی تمام ضروریات پوری کرنے پر مجبور رہوتے ہیں۔ یہ واقعہ 1997 کا ہے جب آمد ورفت کے ذرائع مفقود تھے اور قابلِ ذکر آسانی مہیا نہیں تھی۔ لوگ اپنی اشیاء خورد ونوش اور تجارت کے لیے عموماً سخی سرور کوئٹہ روڈ جو اس گاؤں سے 16 یا 17 کلومیٹر دور تھی پیدل سفر کیا کرتے تھے۔ بعد میں سخی سرور کوئٹہ روڈ پر کوئی سرکاری یا پرائیویٹ بس استعمال کر کے سخی سرور جاتے یا وہاں سے بھی آگے ڈیرہ غازی خان شہر جا کر اپنی اپنی ضرورت پوری کرتے۔ سب سے بڑا مسئلہ بیمار لوگوں کے

لیے ہوتا تھا۔ اس گاؤں کے بیمار بوڑھے اور بچے عموماً چارپائیوں پر دراز ہوتے اور مقامی لوگ یا قریبی رشتہ دار اس چارپائی کو اُٹھا کر سخی سرور کوئٹہ روڈ تک پہنچتے، چونکہ کوئی باقاعدہ سڑک والا سلسلہ ابھی مفقود تھا اس لیے مقامی لوگوں نے مزدا گاڑیاں وغیرہ شروع نہیں کی تھیں۔

ایسا ہی محل وقوع تھا جب میں اور میرا ڈرائیور اس دور دراز واقع گاؤں میں اپنا فیلڈ ورک مکمل کرنے کے بعد گاڑی میں بیٹھ رہے تھے کہ پانچ چھ افراد چارپائی اُٹھائے نظر آئے اور ہمیں رکنے کا اشارہ کیا۔ ہم رک گئے۔ میں گاڑی سے باہر آیا اور خیریت دریافت کی۔ دونوں طرف سے خیر خیریت کا تبادلہ ہونے کے بعد ان لوگوں کے ایک نمائندہ نے خواہش کا اظہار کیا کہ یہ میرے والد صاحب ہیں اور دو دن سے ان کی طبیعت خراب ہے، آپ برائے مہربانی راکھی گارج تک جہاں آپ جارہے ہیں لے جائیں، وہاں ہمارے کچھ رشتہ دار موجود ہیں۔ وہ آپ سے والد صاحب کو وصول کر کے سخی سرور لے جائیں گے اور وہاں کے BHU میں ڈاکٹر صاحب کو دکھا کر علاج کروائیں گے۔ میں نے اس بوڑھے شخص کو دیکھا جس کی داڑھی مہندی لگانے کی وجہ سے ہلکی سرخ رنگ کی تھی اور بھلی لگ رہی تھی۔ اس کی جلد کا رنگ مقامی لوگوں کی طرح گندمی تھا اور باقی جثہ بھی مقامی لوگوں کی طرح ہی تھا۔ یعنی کوئی زیادہ موٹاپا نہیں تھا۔

چنانچہ میں نے اس بوڑھے شخص کو اپنے اور ڈرائیور کے درمیان بٹھایا اور ان لوگوں سے وعدہ کیا کہ میں کوشش کر کے ان کو خود ہی سخی سرور لے جاؤں

گا۔ جو میرے کیمپ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ سن کر وہ لوگ بہت خوش ہوئے اور میرا شکریہ ادا کرنے لگے۔

باباجی کے بیٹھنے کے بعد میں دروازے والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور ڈرائیور کو بولا کہ چلو چلیں۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی اور پہلا گیئر لگایا تو میں نے باباجی سے پوچھا۔ باباجی کیا بات ہے ؟ طبیعت میں کیا مسئلہ ہے ؟ تو باباجی بولے بس کھانسی آتی ہے اور سینہ جکڑا ہوا ہے۔ میں بولا ان شاء اللہ آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ بس یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں باباجی نے ہلکی سی سانس لی اور اپنا سر میرے دائیں کندھے پر رکھ دیا۔ میں نے کہا، باباجی باباجی، لیکن باباجی کا وقت پورا ہو گیا تھا۔ آنکھیں کھل گئیں، منہ بھی کھل گیا اور میرے محسوسات نے اطلاع دی کہ باباجی کے سانس مکمل ہو گئے ہیں اور اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ میں نے ڈرائیور کو فوری طور پر بریک لگانے کا کہا۔ باباجی کو سیدھا کیا اور ڈرائیور کو کہا کہ باباجی کے جسم کو ذرا سنبھالے۔ دروازہ کھولا اور وہ لوگ ابھی زیادہ دور نہیں گئے تھے۔ میری نظروں اور آواز کی حد میں ہی تھے۔ میں نے ان کو آواز دی کہ آجائیں۔ فوراً آجائیں۔ ان کے پہنچتے پہنچتے میں نے اور ڈرائیور نے باباجی کا جسدِ خاکی گاڑی سے نکالا اور نیچے زمین پر سیدھا چت لٹا دیا۔ اسی اثنا میں ان کے لواحقین بھی پہنچ گئے اور میری مدد کرنے لگے۔ میں نے سب سے پہلے باباجی کی آنکھیں بند کیں اور پاؤں کے دونوں انگوٹھوں کو آپس میں باندھا۔ پھر باباجی کی پگڑی سے ٹھوڑی اور سر کو یکجا کیا۔ یہ عمل کرنے کے بعد ان لواحقین کو ساری

صورتِ احوال سے آگاہ کیا۔ افسوس کا اظہار کیا اور ان سے اجازت لے کر وہاں سے اپنے کیمپ کی طرف چل دیا۔ کیمپ پہنچ کر اہلِ کیمپ کو پوری روداد سے آگاہ کیا اور کچھ دیر بعد بات آئی گئی ہو گئی۔

شاید ایک ماہ کا بھی عرصہ نہیں گزرا تھا کہ مجھے اسی گاؤں میں ایک بار پھر سروے کے سلسلہ میں جانا پڑ گیا۔ نمونہ جات اکٹھا کرنے اور دوسری یادداشتیں تحریر کرنے میں دوپہر ڈھل گئی اور سورج کی تمازت میں بھی کمی آگئی تو میں ذرا ستانے کی غرض سے ایک سایہ دار درخت اور مناسب آرام گاہ تلاش کرنے لگا۔ تھوڑی کوشش کے بعد ہی مطلوبہ جگہ مل گئی اور میں اس کی طرف لپکا۔ پہلے پہل تو کسی اور شخص کی موجودگی کا احساس نہ ہوا لیکن جب میں وہاں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا تو وہاں ایک اور شخص بھی بیٹھا ہوا تھا اور شاید میری طرح ہی استراحت کرنا چاہتا تھا۔ پہلے پہل تو اس کی طرف دھیان نہیں گیا لیکن جب میں بیٹھ گیا تو اس سے آنکھیں چار ہوئیں اور اس کے چہرے کی طرف دھیان گیا' دھیان کیا گیا میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کی شکل وضع قطع لباس یہاں تک کہ داڑھی کی مہندی شدہ رنگت۔ اُف میرے اللہ یہ کیا دیکھ رہا ہوں۔ میری زبان بالکل خشک ہو گئی اور تالو کے ساتھ چپک گئی۔ آنکھیں میری پھیل گئیں اور ایسے محسوس ہوا جیسے ٹانگیں ساتھ ہی نہیں ہیں۔ میں نے سوچا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ کیسے ہوا ہو گا؟ اس شخص کو جو میرے ساتھ بیٹھا ہوا ہے میں نے خود اپنے ہاتھوں سے مردہ شخص کے عوامل سے گزارا ہے۔ یعنی سیدھا لٹایا، پاؤں کے

انگوٹھے باندھے، پگڑی سے سر اور ٹھوڑی کو باندھا اور لواحقین کے حوالے کیا۔
یہ تو مر چکا تھا لیکن زندہ کیسے ہو گیا۔ میں ادھر ادھر دیکھوں کہ شاید کوئی اور
انسان یہاں ہو تو بوقتِ ضرورت میری مدد کر سکے لیکن کوئی نہ تھا۔ میں اس
سراسیمگی کی حالت میں تھا اور کوئی دوسرا چارہ کرنے کی کوشش میں تھا جبکہ زبان
تالو کے ساتھ چپکی ہوئی تھی اور سارا دن کام کرنے کی وجہ سے جسم پہلے ہی تھکا
ہوا اور اوپر سے یہ ناگہانی صورتِ احوال، غرضیکہ واقعی کاٹو تو لہو نہیں کہ
مصداق تھی۔ اس شخص نے بھی میری طرف دیکھا اور تھوڑی دیر کے بعد
السلام علیکم کہا۔ میں وعلیکم السلام کیسے کہتا، آواز تو بند ہو گئی تھی لیکن جب اس
نے میرا نام لیا اور پچھلے مہینہ والا واقعہ کا اشارہ کر کے میرا شکریہ ادا کیا تو کچھ جان
میں جان آئی۔ منہ میں کچھ نمی کا احساس ہوا اور تالو نے زبان چھوڑ دی لیکن ابھی
صورتحال آدھی آدھی تھی۔ بہر حال اس نے جب اپنے بھائی 'باکو' کا ذکر کیا کہ
وہ پچھلے مہینے آپ کے ساتھ گاڑی میں سخی سرور جانے کے لیے آ بیٹھا تھا اور بیٹھتے
ہی اس کا بلاوا آ گیا اور وہ اللہ کو پیارا ہو گیا تو یقین کریں میری ساری جسمانی اور
روحانی طاقتیں واپس آ گئیں۔ میں تقریباً ہوش میں آ گیا اور اپنی اندرونی بزدلانہ
اور ڈری ہوئی طبیعت کو کسی حد تک کنٹرول کرنے میں کامیاب ہوا۔ اچھا تو اس کا
نام باکو تھا۔ مجھے تو اس کے نام کا ہی نہیں پتا تھا۔ پہلے پہل تو مجھے اپنے الفاظ کی
گونج کافی دور سے آتی ہوئی معلوم ہوئی لیکن آہستہ آہستہ جب ڈر اور خوف کی
علامات رخصت ہوئیں تو میں ذرا کھل کر باتیں کرنے لگ پڑا۔ تمھارے بھائی کی

عمر کیا تھی اور وہ تمھارا بالکل مکمل ہم شکل تھا اور تم لوگ یہاں کب سے ہو ؟ ایسی باتیں کر کے میں نے اپنا حوصلہ اور اعتماد بحال کیا اور تقریباً نارمل ہو گیا۔ تو صورتحال یوں تھی کہ اس کا نام اکو تھا اور یہ باکو جو پچھلے ماہ فوت ہو گیا تھا اس کا سگا چھوٹا بھائی تھا لیکن اتنی مماثلت شکل و صورت اور عادت و خصائل میں کہ اللہ کی پناہ اور تھوڑی دیر اگر اکو نہ بولتا تو یا میں بے ہوش ہو جاتا یا یہ سمجھتا کہ مردہ زندہ ہو گیا۔ بہر حال کچھ دیر بعد جب میں کافی بھلا چنگا ہو گیا تو اُٹھا اور جانے کے لیے اس سے اجازت لی۔ وہ جانے تو نہیں دے رہا تھا۔ اصرار کر رہا تھا کہ کچھ کھا پی کر جاؤں لیکن میں جلدی سے سلام کر کے گاڑی کی طرف چل پڑا۔ گاڑی میں بیٹھا اور کیمپ کی طرف روانہ ہو گیا۔ کیمپ جا کر اپنے ساتھیوں کو یہ سارا ڈرامہ سنایا اور اپنا خوب مذاق بنایا۔

باب ششم

# کیمپ اور سفر کی صعوبتیں

اللہ کسی کو کیمپ میں بیمار نہ کرے' یہ دعا ہم میں سے ہر کوئی کرتا تھا۔ باوجود اس سچائی کے کہ کیمپ انچارج اور میس انچارج بمعہ کیمپ کے میس باورچی کے' بیمار شخص چاہے وہ سٹاف ممبر میں سے ہوتا یا آفیسر ممبرز سے بلا تمیز ان کی خاطر مدارت اور خیال رکھنے میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی یا فرق نہ رکھتے لیکن پھر بھی کیمپ میں ایک بیمار شخص کا پڑا رہنا گھر کے مقابلے میں جہاں اپنے گھر والوں کی اشکال آدھی بیماری کو رفع کرنے کا موجب ہوتی ہیں اور پھر گھر کا ماحول، تیمارداروں کا خلوص اور مشورے بیماری کے اثرات کو جلد زائل کرتے ہیں وہاں کیمپ کی چارپائی پر لیٹے سارا سارا وقت چھت پر نظریں جمائے اپنے ساتھیوں کا انتظار یا باورچی کا انتظار کرتے رہنا انتہائی اذیت دہ ماحول سے کم نہیں ہوتا تھا۔ اس پریشان کن اور تکلیف دہ صورت حال سے بچنے کے لیے تقریباً سب ہی کیمپ سے چھٹی لے کر گھر جانے کو ترجیح دیتے۔ کیمپ میں عام سی بیماریاں جیسے سر درد، پیٹ

درد، بد ہضمی یا پیچش کسی حد تک اتنی تکلیف دہ نہیں ہوتی تھیں اور بیمار کسی نہ کسی طرح ان بیماریوں کا مقابلہ کیمپ میں رہ کر کر لیتا تھا لیکن خدا نخواستہ اگر ملیریا ہو جاتا اور بعد میں ٹائیفائڈ میں بدل جاتا تو پھر جو مرضی کر لیں کیمپ میں ایک یا دو دن سے زیادہ رہنا ممکن ہو جاتا اور بیمار شخص فوراً چھٹی لے کر اپنے آبائی گھر جانے کی تیاری کرتا اور گھر جا کر صحت مند ہو کر پھر کیمپ پلٹتا۔

## ملیریا بخار کا حملہ

میرے ساتھ بھی ایک ایسا ہی معاملہ ہوا۔ ملیریا کا پہلا وار ڈیرہ غازی خان کے دور افتادہ ایک فیلڈ کیمپ میں پیش آیا۔ یہ غالباً جولائی 1987 کے لگ بھگ کا واقعہ ہے جب ہمارے کیمپ میں ملیریا بخار آگیا۔ پہلے پہل تو ملیریا بخار میں جو کیفیت ہوتی ہے، میں اس سے بالکل نابلد تھا کیونکہ زندگی میں پہلی بار مجھے اس تکلیف دہ بیماری سے واسطہ پڑا تھا۔ کڑوی کڑوی گولیاں نگلنا اور وہ بھی سوکھے پانی کے ساتھ پھر باورچی نے جب تک دوسرے افسران کو کھانا دینا تب تک اس کا انتظار کرنا، پھر وقت ملنے پر اس باورچی کا میرے کمرے میں کھانا لانا اور وہی کھانا جو عام میس میں پکا ہے جس میں تندور کی روٹیاں اور سالن غرض یہ کہ بیمار کے کھانے میں اور صحت مند افراد کے کھانے میں کوئی فرق نہیں۔ دوائی کھانے کے لیے جو بھی کھانا ملتا کھانا پڑتا لیکن بعد میں جب ابکائیاں آتیں تو لگ پتا جاتا۔ اسی دوران کوئی پوچھنے آیا کوئی نہ آیا اور معاملہ بڑھتا رہا۔ تنگ آ کر کیمپ سے چھٹی لی اور ڈیرہ غازی خان اپنے ریسٹ ہاؤس چلا گیا۔ وہاں سے پروگرام بنایا کہ لاہور جایا

جائے چنانچہ وہاں احسان مغل صاحب نے پہلی دستیاب بس کا ٹکٹ خریدا اور مجھے اس پر سوار کرا دیا۔ ملیریا بخار کو کیسے نبھانا ہے اور کیا کیا احتیاطی تدابیر کرنی ہیں کچھ بھی پتا نہیں تھا۔ بس اللہ کے آسرے بیگ تھامے بس میں بیٹھ گیا۔ غازی گھاٹ پل تک تو کچھ خیریت گزری لیکن جیسے ہی غازی گھاٹ کا پل کراس کیا جسم اور سر دونوں شدید قسم کے درد میں مبتلا ہو گئے۔ ملیریا بخار جو بظاہر گھر جانے کے تصور سے کچھ کم ہوا لگتا تھا دوبارہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ حملہ آور ہو گیا۔ میرا سر سیٹ کی پشت پر ٹکنے کی کوشش کرتا رہا لیکن مکمل ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ ساتھ والا مسافر بیچارا الگ بے چین تھا۔ مجھ سے بولا، آپ کو تو شدید بخار ہے، آپ اس طرح کریں کہ ملتان کسی ہوٹل میں ٹھہر جائیں اور طبیعت ساز گار ہونے کی صورت میں لاہور کا باقی ماندہ سفر مکمل کریں۔

اس کا مشورہ کافی بہتر لگا اور میں ملتان کے اڈے پر اتر گیا۔ وہیں ایک عدد کمرہ کرائے پر لیا۔ کمرہ کیا تھا اغوا کاروں کا کوئی سیل نما ٹھکانہ تھا۔ اینٹوں کا فرش، ایک عدد لکڑی کے پایوں والی چارپائی اور وہ بھی نیچے کو دھنسی ہوئی۔ ساتھ ایک لکڑی کا میز جس پر ماہ سال کا گرد و غبار اور اس پر چائے کے داغ اور سب سے اعصاب شکن یہ کہ 25 واٹ کا ایک بلب۔ کمرہ تو میں نے کرائے پر لے لیا اور سارا کرایہ بھی ادا کر دیا لیکن کمرے کا ماحول بجائے مجھے راحت دینے کے مزید تکلیف اور اندیشوں میں مبتلا کر گیا۔ تقریباً 10 منٹ کے بعد ابکائیوں کا دور پھر سے شروع ہو گیا۔ ابکائیاں ایسی تھیں کہ میں ایک ہی سانس میں لمبی ڈبکی لگا رہا تھا۔ اب

یہ خوف کہ یہاں تو میرا سر یا کمر سہلانے والا بھی کوئی نہیں جبکہ کیمپ میں اور ڈیرہ غازی خان ہوسٹل میں تو پھر کوئی نہ کوئی ابکائیوں کی آواز سن کر آجاتا تھا اور سہارا بنتا تھا۔ یہاں پر تو اتنے شور شرابے میں کسی کو کیا پتا کہ اس کمرہ میں کوئی شخص جان سے جارہا ہے۔ ایسے خیالات کا آنا تھا کہ سراسیمگی کی ایک لہر ریڑھ کی ہڈی سے بجلی کی سرعت کے ساتھ آئی اور گزر گئی۔ مرتا کیا نہ کرتا دوبارہ شوز پہنے، بیگ ہاتھ میں تھاما اور کمرہ چھوڑ دیا۔ ہوٹل کے مالک سے اپنا شناختی کارڈ لیا اور نیو خان کی ایک لمبی بس میں سوار ہو گیا۔ مکمل فاقہ سے تھا اور یہ اچھی طرح جان چکا تھا کہ جب تک پیٹ خالی ہے ابکائیاں نہیں آئیں گی اور پیٹ میں مزید کوئی چیز نہیں ڈالنی چاہیے۔ قسمت اچھی تھی کہ اس بس کی آدھی سیٹیں خالی تھیں اس لیے پیچھے جا کر ایک خالی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے مہربانی کی کہ نیند آنا شروع ہو گئی اور جانے کب ساہیوال آیا اور کب لاہور، کوئی اندازہ نہ ہوا۔ ملتان روڈ چونگی پر علم ہوا کہ لاہور آگیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے مزید مدد مانگی اور وحدت روڈ موڑ پر اتر گیا۔ وہاں صبح کا وقت تھا۔ رکشے سواریوں کے انتظار میں قطار لگائے کھڑے تھے۔ سب سے پہلے رکشہ میں رحمان پورہ کا ایڈریس سمجھا کر بیٹھ گیا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ بعد گھر کے دروازہ کے باہر تھا۔ جوں ہی گھنٹی بجائی اور رکشہ والے کا حساب کتاب کیا دروازہ کھلا اور میں دھڑام سے گھر کے اندر۔ والدین حج پر گئے ہوئے تھے۔ چھوٹی بہن ساجدہ جو ماشاء اللہ بہادر و عقل مند تھی، میری اس طرح کی آمد سے کچھ گھبرا گئی لیکن استفسار پہ جب ساری صورتِ احوال بتائی تو سمجھ گئی

کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ بہر حال گھر پہنچ چکا تھا۔ آدھی بیماری کو شکست ہو چکی تھی۔ اسی وقت ڈاکٹر حسن صاحب نے ٹائیفائیڈ کے مقابلہ کرنے والی میڈیسن تجویز کی۔ گھر کے ماحول نے، گھر کی خوراک نے اور بہن بھائیوں کی اشکال نے دوسرے یا تیسرے دن ٹائیفائیڈ کو شکست دے دی۔ بدنی کمزوری اور سفر کی صعوبت کے پیشِ نظر دو ہفتہ گھر میں قیام کیا۔ اسی دوران والدہ محترمہ اور والد محترم حج سے واپس آگئے اور ان کے دیدار ہی سے بیماری اور کمزوری ایسے بھاگی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔

## مرنے کا سارا سامان

یہ واقعہ اپریل یا آغاز مئی 2002 کا ہے اور مقام ہے کرک (KPK)۔ یہ واقعہ میری مکمل کوشش رہی کہ کسی جگہ بھی بیان یا رپورٹ نہ ہو لیکن میرے دوستوں خاص کر جناب ممتاز فاروق صاحب کی خواہش تھی کہ اس واقعہ کو لازمی تحریر کیا جائے تاکہ ہمارے جاننے والوں کو ایک تو ہماری کیمپ کی زندگی کا ہلکا سا اشارہ ملے اور دوسرا ہم خود اپنے پاؤں میں کیسے کلہاڑی مارتے تھے، اس کا بھی ادراک ہو۔

پیدل سروے کیمپ جو کم و بیش آٹھ یا نو ماہ تک مصروف عمل رہا اور کافی کامیابیاں سمیٹنے کی وجہ سے معروف بھی ہوا بالآخر اپنے اختتام کو پہنچنے کے قریب ہوا اور یہ آخری دن تھا جب ہم لوگوں نے کیمپ کو بند کیا۔ سارا سامان ٹرکوں اور پک اپس میں لوڈ کیا اور یہ لوڈڈ ٹرانسپورٹ صبح صبح ہی لاہور کی طرف روانہ کر دی۔

چونکہ گرم موسم کا آغاز ہو چکا تھا اور کرک شہر میں خربوزہ، تربوز اور دوسرا گرمیوں کا میوہ بآسانی دستیاب تھا اس لیے کیمپ والوں نے کچھ تربوز بھی خریدے ہوئے تھے اور ان کو فریزر میں ٹھنڈا کرنے کے لیے رکھا ہوا تھا۔ ایک بات ضرور ذہن میں رکھیں کہ کیمپ کلوزنگ کسی عید کے دن کی طرح ہوتی تھی۔ سب لوگ بے تحاشہ خوش ہوتے کہ اب اگلا فیلڈ موسم جو کہ کم از کم چار یا پانچ ماہ کے بعد آتا تھا اس وقت تک لاہور آفس اور گھر میں اپنی فیملیز اور بچوں کے ساتھ رہیں گے، گھومیں پھریں گے۔ اور جو جو کام فیلڈ ورک میں مصروف ہونے کی وجہ سے رکے تھے وہ کریں گے چنانچہ جس دن لاہور پہنچنے کا شیڈول ہوتا وہ بلاشبہ عید کے دن کی طرح خوشیاں بانٹتا اور ہر طرف مسرت کا سماں چھایا محسوس ہوتا۔ وہ دن بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ میں نے دو پراٹھے اور دو انڈوں کا آملیٹ بنوایا اور خوب مزے لے کر کھایا کیونکہ ارادہ دوپہر کے کھانے کا نہیں تھا بلکہ رات کو عشائیے کا تھا جو ہم نے راولپنڈی میں مٹن کڑاہی، مرغ کڑاہی اور کابلی پلاؤ جیسی عیاشیوں کے ساتھ کرنے کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ دو پراٹھے بمعہ آملیٹ کھانے کے بعد چائے کا بڑا کپ نوش کیا اور تھوڑی دیر کے بعد ممتاز فاروق صاحب کہنے لگے، عباس قریشی یار دہی پڑا ہوا ہے کیوں نہ اس کی لسی بنائی جائے اور پی جائے کیونکہ ابھی ہمارے گاڑی کی روانگی میں تھوڑا وقت ہے۔ میں نے ذرا بھی توقف نہیں کیا اور سر ہلا کر ان کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ تھوڑی دیر میں لسی کا بڑا سا ڈول تیار ہو گیا اور ہم نے مزے لے لے کر دو دو گلاس لسی کے پی

لیے۔ اسی دوران تربوز پر نظر پڑی تو باورچی سے کہہ کر اس کو کٹوا کر اور سرخ دیکھ کر سوچا یار لمبے سفر پہ چلنا ہے، اس نعمت خداوندی کو بھی چکھ لیا جائے۔ چکھنا کیا تھا بلکہ شروپ شروپ کھانا شروع کر دیا۔ ہاتھ اس وقت رکا جب پیٹ نے واضح پیغام دیا کہ جناب بس، اس سے مزید آگے کوئی گنجائش نہیں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ پیٹ ایک تو بھاری پن کا شکار ہو گیا اور دوسرا جو بے چینی تھی وہ بوجھل پن میں بدلنا شروع ہو گئی۔ گاڑیوں کی آمد کے ساتھ ہی ہم سب لوگ اپنی مخصوص گاڑیوں میں بیٹھے۔ میرے حصے میں سیدے خان ڈرائیور کی سنگل کیبن گاڑی آئی اور میں نے احتیاطاً دو پیپسی کی ڈیڑھ لیٹر والی بوتلیں پانی سے بھر کر رکھ لیں کہ شاید راستے میں ضرورت پیش آئے لیکن یہ بات ذرا بھی ذہن میں نہ تھی کہ ضرورت کس قسم کی پیش آ سکتی ہے۔ گاڑیوں نے کیمپ کو چھوڑا اور ممتاز فاروق صاحب کی گاڑی میری گاڑی سے آگے تھی جیسے ہی انڈس ہائی وے شروع ہوئی تو پیٹ سے عجیب عجیب قسم کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ ساتھ ہی پیٹ پھولنا شروع ہو گیا۔ اب اس پھولے پیٹ کو زبردستی قابو کرتے ہوئے خاموشی کے ساتھ سفر شروع ہو گیا۔ سیدا خان ڈرائیور باتیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اتنے لمبے سفر میں دھیمی دھیمی باتیں سفر کی تھکان یا بوریت اور لمبی مسافتوں کو ختم کر دیتی ہیں۔ لیکن میں اس وقت اپنے پیٹ کے ہاتھوں مجبور، باتیں مجھ سے ہو نہ سکیں اور پیٹ ایسے کہ ابھی کے ابھی سارا کچھ اگل دے۔ میں نے ڈرائیور کو کہا کہ ذرا گاڑی روکو مجھے نہیں پتا کہ ٹریفک آ رہی ہے جا رہی ہے لوگ سڑک کے

کنارے ہیں یا نہیں، میں نے ان دو پانی والی بوتلوں میں سے ایک بوتل کو پکڑا
اور تقریباً چلتی گاڑی میں سے اترا اور سڑک کے کنارے ہلکے سے اوٹ کو
استعمال کرتے ہوئے واش روم بنایا تو انکشاف ہوا کہ پیٹ سخت ناراض ہو گیا ہے۔
صبح ناشتہ اور ناشتے کے بعد کا سارا سامان پیٹ سے برداشت نہیں ہوا اور ایک
زبردست قسم کی فوڈ پوائزننگ کا حملہ ہو گیا۔ بہرحال وہاں فراغت کے بعد
سانس ذرا بحال ہوا اور وہی پانی والی بوتل کا استعمال برائے حامل پاکیزگی کیا اور
دوبارہ گاڑی میں بیٹھا۔ میں نے سیدے خان کو گاڑی چلانے کا کہا اور کچھ دیر کے
لیے حالت سکون میں آیا۔ لیکن یہ حالت سکون دس منٹ سے زیادہ کی نہ تھی۔
پیٹ دوبارہ سے سٹارٹ ہو گیا۔ وہی آوازیں اور مروڑ اٹھنے لگے اور میری حالت
اس انکشاف سے کہ کوئی کھانے کی چیز پیٹ کو خراب کر گئی ہے اور میں شدید قسم
کی بدہضمی میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ سخت مایوسی کا شکار ہو گیا۔ سفر ابھی کٹا ہی کتنا تھا
کہ یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ پھر کوہاٹ بائی پاس کے قریب ایک بار پھر گاڑی
رکوائی۔ فراغت حاصل کی اور پھر سیدے خان کو بتا دیا کہ سیدے خان پیٹ چالو
ہو گیا ہے اب دیکھو یہ سلسلہ کہاں رکتا ہے۔ سیدے خان کہے، صاحب جی فکر نہ
کریں اللہ بھلا کرے گا۔ پھر یہ سلسلہ چلتا رہا میں پانی کی دونوں بوتلیں بھرتا رہا
اور بوتلیں خالی ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ گمبٹ اور گمبٹ سے آگے خوشحال
گڑھ کا پل گزرا اور ہم پنجاب میں داخل ہو گئے۔ اب مجھے کمزوری کا احساس
شدت سے ہونے لگا۔ جسم میں موجود نمکیات اور پانی تیزی سے کم ہونے لگے۔

ڈی ہائیڈریشن کا حملہ شدید ہو گیا۔ مجھے خواہش ہوئی کہ ممتاز فاروق صاحب کو کوئی اندازہ ہو جائے اور وہ مجھے مل لیں ، اور میرے لیے کوئی علاج وغیرہ کا بندوبست کریں لیکن ان کو شاید اندازہ نہ ہوا اور میں اس اذیت والی مصیبت میں گرفتار رہا۔ پھر آہستہ آہستہ پیٹ شاید خالی ہو گیا لیکن مروڑ والی کیفیت اور موشن والی کیفیت برقرار رہی، اور جنڈ کا علاقہ شروع ہو گیا۔ جنڈ سے تقریباً 50 کلو میٹر کے فاصلے پر ممتاز فاروق صاحب کی گاڑی کھڑی ہوئی نظر آئی۔ پاس آکر میں نے دیکھا تو ممتاز فاروق صاحب گاڑی میں بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے، کیا بات ہے اتنی آہستہ کیوں آرہے ہو؟ میں بھنا بیٹھا تھا۔ چھوٹتے ہی جو منہ میں آیا بک دیا، کہ تم لوگوں کو ذرا خیال نہیں پچھلی گاڑی کو ساتھ ملا کر چلتے ہیں اور مجھے پیچش لگ گئے ہیں۔ میرا بچنا محال ہے۔ بس اب ایک کام رہ گیا ہے میری لاش کو لاہور میرے گھر میں پہنچا دینا۔ اس کے علاوہ بھی جو منہ میں آیا کہہ دیا۔ ممتاز فاروق صاحب کا یہ اعجاز ہے کہ کڑوی سے کڑوی بات بھی انتہائی صبر سے برداشت کر لیتے ہیں، اس لیے ٹھنڈے ٹھار ہو کر میری ساری کڑوی کسیلی باتیں سنیں اور بولے، بھائی جان فکر نہ کریں آگے فتح جنگ کا شہر آرہا ہے ممکن ہے وہاں کوئی اچھا میڈیکل یونٹ مل جائے اور وہاں ڈاکٹر کو دکھا کر ہم اس مسئلے کا حل کر سکیں۔ بہرحال قصہ مختصر وہاں سے ہم چلے اور راستے میں کئی ایک مقامات پر پانی کی بوتلوں کا استعمال کرتے ہوئے بالآخر فتح جنگ پہنچ گئے۔ وہاں پر سڑک کے کنارے ایک ہسپتال کے بورڈ پر نظر پڑی غالباً الماس میڈیکل سینٹر

کے نام کا ایک کلینک نظر آیا۔ فوراً گاڑیوں کا رخ ہسپتال کی طرف موڑا گیا اور ڈاکٹر صاحب کے کمرہ میں جا کر بیٹھ گئے۔ میرا خیال ہے عصر کا وقت گزر رہا تھا جب ہم الماس میڈیکل سینٹر میں پہنچے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک ڈاکٹر صاحب قد تقریباً ساڑھے پانچ فٹ اور ہٹے کٹے جسم کے مالک تشریف فرما ہوئے اور پوچھا، کیا مسئلہ ہے کیسے آنا ہوا؟ مجھے جتنے مقامات برائے فراغت کے یاد تھے سارے بتا دیے اور فوری علاج کی درخواست کی۔ بولے' صبح کیا کیا کھایا ہے؟ زبان میں تیزی تھی حالانکہ جسم میں ذرا بھر بھی توانائی نہ تھی۔ جو جو کھایا تھا ناشتہ، لسی، تربوز سب کچھ بتا دیا۔ ڈاکٹر صاحب ساتھ ساتھ میرا معائنہ کر رہے تھے ساتھ ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ جب میں نے اپنے تئیں سارا کچھ بتا دیا تو بولے، اونہہ، مرنے کا سارا سامان تو آپ نے خود ہی تیار کر لیا تھا، بہر حال اب آپ اس بیڈ پر لیٹ جائیں تاکہ آپ کو ڈرپ اور انجکشن وغیرہ لگائے جائیں۔ چنانچہ ایک بڑی سی ڈرپ اور اس میں تین عدد مختلف قسم کے انجکشن لگا کر مجھے چت لٹا دیا گیا۔ پھر وقت مقررہ پر جب جسم میں جان آنی محسوس ہونا شروع ہو گئی اور مغرب کا وقت تھا تو ڈاکٹر صاحب نے ایک بار پھر وہی جملہ ادا کیا جو پہلے میں نے تحریر کیا ہے اور متنبہ کیا کہ آئندہ اپنے ساتھ اس طرح کا ظلم نہ کرنا۔ اب آپ جائیں، راستے میں کچھ بھی نہ لینا نہ کھانا اور سفر میں تھوڑا آرام کرتے جانا۔ ڈاکٹر صاحب نے جی بھر کر مجھے شرمندہ کیا اور واقعی بات بھی کچھ ایسی تھی کہ اپنی جان کے ساتھ ظلم تو میں نے خود ہی کیا تھا۔ لالچ کا مارا ہر چیز کھاتا جا رہا تھا

اور نتیجہ کی پرواہ کیے بغیر۔ بہر حال وہاں سے رخصت ہوئے اور باقی ماندہ سفر مکمل کیا۔ راولپنڈی کے نزدیک مقررہ ریسٹورنٹ میں پورا کیمپ موجود تھا۔ جناب ملک ظفر اقبال اور فرخ محمود صاحب کے علاوہ سارا اسٹاف۔ انھوں نے استقبال کیا اور بیماری کی اس حالت پر افسردگی کا اظہار۔ رات کے کھانے کا وقت تھا۔ آڈر دیا جا چکا تھا۔ یار لوگ سیخ کباب، تکہ کباب، پلاؤ اور قسم قسم کی نعمتوں والے کھانے کھا رہے تھے اور میں ان سب کو دیکھ رہا تھا۔ کئی آدھ نے ازراہ تکلف اور کئی ایک نے شرارتاً آفر بھی کی کہ ایک آدھ بوٹی کھالو کچھ نہیں ہوتا لیکن کباب اور بوٹی دیکھ کر اپنا ممکنہ حشر یاد آئے، پھر فوراً معذرت کر لوں۔ پھر ممتاز فاروق صاحب نے ایک ٹھنڈی ٹھار مرنڈا کی بوتل ہاتھ میں تھما دی اور بولے، یہ بوتل چسکی لے کر پیتے رہو اس سے کچھ نہیں ہو گا۔ میڈیسن تو تم نے لے ہی لی ہیں۔ میں نے بوتل ڈرتے ڈرتے لے لی۔ ایک گھونٹ بھرا تو جسم میں کچھ راحت محسوس ہوئی۔ پھر یہی بوتل وقفے وقفے سے پیتا رہا۔ پورے کیمپ نے پیٹ بھر کر باربی کیو کے مزے لوٹے اور عشاء کے کافی بعد پورا قافلہ لاہور کی طرف عازمِ سفر ہوا۔ تقریباً صبح کا وقت تھا جب لاہور شہر میں داخلہ ہوا۔ اب شاید اپنے شہر یا گھر کی خوشبو کا اثر تھا کہ دس بارہ گھنٹے پہلے جو حالت تھی وہ یکدم بہتری کی طرف گامزن نظر آئی۔ مرنڈا کی بوتل کا آخری گھونٹ حلق میں انڈیلا اور گاڑی رحمان پورہ کوارٹرز میں داخل ہو گئی۔ ڈرائیور کو پانی پلایا اور خود گھر کے اندر بیگ سمیت داخل ہو گیا۔

# زہریلی مچھلی

مچھلی کھانے اور شکار کرنے کا شوق بچپن سے پالا ہوا ہے۔ گو مچھلی کے شکار سے تو مکمل توبہ کیے سالوں بیت گئے لیکن قسم قسم کی مچھلی کھانے کا شوق بدرجۂ اتم موجود ہے۔ دریائی مچھلی، فارمی مچھلی کراچی کے ساحل کی مچھلی غرض یہ کہ مچھلی ہونی چاہیے تاکہ اس کا شوق نہ صرف برقرار رہے بلکہ پیٹ پوجا بھی ہوتی رہے۔ مچھلی جیسی بھی پکی ہو فرائی، شوربہ والی یا بھنی ہوئی ہر حالت میں لذیذ لگتی ہے اور کبھی بھی کھاتے ہوئے ہاتھ نہیں رکا۔

یہ غالباً 2004 کے فیلڈ سیزن کی بات ہے، عبدالمجید اظہر صاحب کی کمان میں ہم لوگ ضلع دادو سندھ میں پہاڑی علاقوں میں پیدل اور جیپ سروے کر رہے تھے۔ ٹیم میں میرے علاوہ ڈاکٹر احمد نبی صاحب، ذوالفقار صاحب اور صحبت علی ابرو صاحب شامل تھے۔ اسی دوران عبدالمجید اظہر صاحب بیرونی دورے پر تشریف لے گئے اور کیمپ کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آگئی۔ پیدل سروے اور کچھ تکنیکی ڈیٹا اکٹھا کرنے کے لیے واہی پاندی اور اس کے ساتھ پہاڑی علاقے میں کام کر رہے تھے، جب موسم کی شدت بڑھنے لگی۔ گرمی اس قدر تھی کہ صبح دس بجے ہی فیلڈ ورک کرنا ناممکن ہو گیا۔ موسم کی شدت بڑھتے ہوئے احساس ہوا کہ کہیں یہ نہ ہو دن کے وقت کام کرنا ممکن نہ رہے اور شام کو کام کرنا پڑے یا بالکل ہی ختم کرنا پڑے اور ٹارگٹ مکمل کیے بغیر واپس آفس جانا پڑے۔ اس معاملہ سے بخوبی نمٹنے کے لیے ورکنگ اسکواڈ کو دو ٹیموں

میں بانٹنا پڑ گیا۔ ایک ٹیم جناب احمد نبی صاحب کی زیر نگرانی جاری کام کو مکمل کرنے کے لیے واہی پاندی کیمپ میں ہی رکی اور دوسری ٹیم جس میں صحبت علی ابرو صاحب اور میں شامل تھے جیپ سروے کرنے کے لیے فرید آباد پہنچ گئے۔ کیمپ ہمارا فرید آباد کے ایک سکول میں لگایا گیا اور یہ سکول کے فرسٹ فلور پر تھا۔ ہمارے ساتھ اشفاق کک اور شیر خان ڈرائیور بھی تھا۔ دوسرا ڈرائیور سیدے خان تھا جو سنگل ڈور پک اپ چلاتا تھا۔ پہلے دن ہم لوگ جیپ سروے کے لیے فرید آباد سے مغرب کی طرف دس یا پندرہ کلو میٹر کی مسافت پر موجود شاہ گودرو نامی بستی میں گئے۔ شاہ گودرو کوئی صوفی یا روحانی شخصیت سمجھ لیں جن کے نام پر یہ بستی موجود ہے اور جہاں عقیدت مند تقریباً سارا سال ہی آمد و رفت میں رہتے ہیں۔ یہیں پر جناب احمد خان چانڈیو جو یہاں کے وڈیرے تھے یا سردار، سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے اس علاقہ میں کام کرنے کے لیے سکیورٹی کے حوالے سے کچھ بہترین صلاح مشورے دیے۔ احمد خان چانڈیو بڑی لاجواب شخصیت کے مالک نکلے۔ وہ نہ صرف وڈیرے تھے بلکہ اچھے خاصے پڑھے لکھے امریکن پلٹ پاکستانی نژاد امریکی تھے۔ جیولوجی، اسٹرالوجی اور معاشیات کے ماہر نکلے۔ شکاریات پر بھی عبور حاصل تھا اور ان کی جیپ میں جدید اور نادر رائفلیں دیکھ کافی حیرت ہوئی۔

اسی دن جناب احمد خان صاحب کے ساتھ تھوڑا علاقے کا طائرانہ جائزہ لیا اور اپنے مطلب کے حصوں کو اگلے چند روز کے سروے کے لیے چن لیا۔ اسی

دوران صحبت علی ابرو صاحب نے ہماری ایک یاد گار فوٹو بنائی اور چند گھنٹوں کی اس ملاقات کا اختتام ہوا۔ واپسی پر فرید آباد کے بازار سے گزر ہوا تو وہاں مچھلی برائے فروخت تھی۔ بس پھر کیا تھا جی للچا گیا اور کیمپ میں آتے ہی اشفاق کک کو کہا کہ کل مچھلی پکانی ہے۔ مچھلی کہاں سے ملنی ہے، یہ بھی اسے بتا دیا۔

اگلے دن فیلڈ ورک سے واپسی پر اشفاق کک نے مچھلی پکائی ہوئی تھی اور ہمارے پہنچتے ہی گرما گرم روٹیوں کے ساتھ پیش کی۔ مچھلی خوب مزے لے لے کر کھائی اور خوب پیٹ بھر کر کھائی۔ کھانا کھا کر رات کو جلد ہی سو گئے اور اگلی صبح پیٹ میں درد اور ہلکا ہلکا بخار محسوس ہوا۔ مچھلی شاید خراب تھی یا اچھی طرح سے صاف نہ ہوئی تھی اس لیے انفیکشن کر گئی۔ طبیعت ناساز ہو گئی، اس لیے صحبت علی ابرو صاحب کو اکیلے ہی فیلڈ پر بھیج دیا اور خود کیمپ میں استراحت کے لیے قیام پذیر ہو گیا۔ سب سے پہلا موشن مجھے دوپہر 12 بجے آیا۔ واش روم نیچے گراؤنڈ فلور میں تھا۔ سیڑھیاں چڑھنا اور اترنا بیماری کی حالت میں ویسے بھی تکلیف دہ ہوتا ہے، لیکن کرتا تو کیا کرتا۔ پیٹ میں زبردست قسم کا مروڑ اٹھنا شروع ہو گیا۔ جو پیٹ درد اور موشن کو روکنے والی ادویات ساتھ تھیں، ساری آزما کر دیکھ لیں۔ کوئی افاقہ نہ ہوا اور شام ہوتے ہوتے میں تقریباً ادھ موا ہو گیا۔

صحبت علی ابرو جب فیلڈ سے واپس آئے تو ان کو بتایا کہ یہ معاملہ ہوا ہے۔ انھوں نے کوئی خاص توجہ نہ دی بلکہ اپنے نئے خریدے ہوئے نوکیا موبائل میں کھوئے رہے۔ اگلا دن پھر بیماری کی شدت میں اضافہ کے ساتھ چڑھا اور کھانا

پینا تو درکنار اٹھا بیٹھا بھی نہ جائے۔ واش روم گراؤنڈ فلور پر ہونے کی وجہ سے بھی جسم میں رہی سہی طاقت ختم ہو گئی۔ چنانچہ صحبت علی ابرو صاحب سے کہا کہ چلو نزدیک ترین کسی ہسپتال یا کلینک چلتے ہیں اور کسی مستند ڈاکٹر کو دکھاتے ہیں۔ صحبت صاحب فوراً تیار ہو گئے اور ہم گاڑی میں سوار ہو کر فرید آباد سے میہڑ شہر کی طرف چل پڑے۔ گھنٹہ یا ڈیڑھ گھنٹہ ڈرائیو کے بعد ہم میہڑ شہر پہنچے اور ایک ڈاکٹر صاحب کے کلینک میں پہنچ گئے۔ اس نے چیک اپ کیا، فوراً لٹا دیا اور ڈرپ لگا دی۔ پھر وہی انجکشن اور علاج۔ بہرحال ظہر کے وقت ڈرپ ختم ہوئی اور ہم ڈاکٹر صاحب سے ضروری ہدایات اور باقی ماندہ دوائیاں لے کر میہڑ سے فرید آباد کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابھی شہر میں ہی تھے کہ صحبت علی ابرو صاحب نے وہاں سے ایک باربی کیو شاپ سے مرغی کا ایک روسٹڈ لیگ پیس خریدا اور گاڑی میں میرے ساتھ بیٹھ گئے۔ بیٹھتے ہی ابرو صاحب نے مرغ پیس میری طرف آفر کے انداز میں پیش کیا، کہا چکھ لیں۔ پھر فوراہاتھ واپس کھینچ لیا اور بولے، اوہو سر جی آپ کا تو پیٹ خراب ہے۔ مجھے غصہ تو بہت آیا کہ شریف آدمی اگر آپ کو حالتِ زار کا اچھی طرح اندازہ ہے تو پھر آفر کیوں کر رہے ہو بلکہ دل کیوں جلا رہے ہو؟ لیکن میں بولا کچھ نہیں صرف سوچ میں پڑ گیا کہ صحبت علی ابرو صاحب کیسے دلچسپ آدمی ہیں۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد شاید ڈرپ اور اس میں لگے انجکشنوں کا اثر تھا کہ جلد ہی نیند آ گئی۔ اور آنکھ تب کھلی جب فرید آباد میں ہمارا کیمپ آگیا۔ صحبت علی ابرو صاحب واقعی ایک لاجواب شخصیت کے مالک ہیں۔ اب

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ ذوالفقار صاحب، عبدالجبار چنا اور صحبت علی آبرو صاحب میں سے سینیئر کون ہے ہاں اتنا علم ہے کہ یہ تینوں صاحبان اوپر تلے لاہور آفس میں، جوائننگ کے لیے تشریف لائے اور اپنی محنت، لگن اور شوق کی بدولت جلد ہی اچھے افسران میں شمار ہونے لگے۔ ان تینوں میں سب سے زیادہ قد آور شخصیت صحبت علی ابرو صاحب کی تھی۔ ابرو صاحب بہترین تراش خراش کالباس پہننے والے، خوبصورت الفاظ کے چناؤ اور استعمال میں ماہر اور سب سے اعلیٰ وصف انگریزی بولنے میں مہارت تھی۔ انگریزی بہترین بولتے لیکن دفتر کی لکھت پڑھت میں تھوڑے ہلکے تھے۔ میں ان کو بار بار اس کمزوری کی طرف توجہ دلاتا رہتا تھا کہ اس میں بھی مہارت حاصل کریں۔ شوخ، چنچل اور شرارتی بہت تھے۔ بعض دفعہ تو اپنی اس طبیعت کی وجہ سے کافی غلطیاں بھی کر جاتے۔ نئی نئی چیزیں خریدنے کا بہت شوق تھا۔ مجھے یاد ہے اس سروے پروگرام میں جب جب ابرو صاحب کو شامل کیا گیا تو اس وقت کے حساب سے ان کو اچھی خاصی رقم بطور TA/DA ایڈوانس بھی ملی۔ یہ ایڈوانس انھوں نے کم از کم ایک ماہ تک تو استعمال کرنا ہی تھا۔ لیکن جیسے ہی رقم ہاتھ آئی موصوف فوراً نزدیکی مارکیٹ پہنچے اور ایک عدد موبائل فون خریدا اور باقی ساری رقم پری پیڈ بل جمع کروادی۔ یہاں سے ہاتھ دھونے کے بعد اپنی تنخواہ نکلوائی اور ساتھ رکھ لی۔ ان دنوں موبائل فون اور ان کا خرچہ کافی ہوتا تھا لیکن موصوف جیسے ہی موبائل سے فیض یاب ہوئے، مجھے میرے گھر کے ٹیلی فون پر آگاہ کرنے لگے کہ اب ہم

کہاں ہیں اور کتنی دیر میں کہاں پہنچیں گے۔ میں بڑا حیران ہوا کہ شاید ابرو صاحب کو اندازہ نہیں کہ موبائل سے ایک منٹ کی فون کال کا کیا خرچہ ہے یا جوش میں ہوش کھو بیٹھے ہیں۔ وہی ہوا کچھ گھنٹوں کے بعد ابرو صاحب کے موبائل فون سے کالنگ بند ہوگئی اور میں سمجھ گیا کہ فون میں پری پیڈ خرچہ ختم ہو گیا ہے۔ پھر ایک اور بات جو ابرو صاحب کے شاہانہ طرزِ زندگی کی طرف ہلکا سا اشارہ کرتی ہے وہ یہ کہ شاید بقول شیر محمد (مرحوم) ڈرائیور ساہیوال کے نزدیک ان کی گاڑی کی زد میں کسی جانور کا بچہ آکر مر گیا۔ لوگ اکٹھے ہوگئے جیسا کہ اکثر ایسے معاملات میں ہوتا ہے، جس آدمی کا نقصان ہوا تھا اس نے ہرجانے کا تقاضا شروع کر دیا اور بڑھ بڑھ کر باتیں بنانا شروع کر دیں۔ معاملے کو بگڑتا دیکھ کر جناب ابرو صاحب نے نقصان کی مالیت کے بارے میں دریافت کیا تو مالک نے پانچ ہزار روپے کا تقاضہ کیا۔ ابرو صاحب نے فوراً پانچ ہزار روپے اس کے ہاتھ میں رکھے اور گاڑی میں بیٹھ کر کوچ کا حکم جاری فرما دیا۔ انھوں نے کسی بھی قسم کی کوئی کوشش نہ کی کہ ان کے ساتھ بحث کر کے کم از کم پیسے ہی کم کروالیں۔ بعد میں بھی ابرو صاحب کے کمالات سے بارہا فیض یاب ہونے کا اتفاق ہوتا رہا۔ اللہ ان کو خوب ترقی دے۔ ویسے ہمارے محکمے کا ایک بیش قیمت اثاثہ ہیں اور یقیناً مستقبل میں ان سے بہت اچھی توقعات وابستہ ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ اس نوعیت کے درجنوں واقعات جو میرے اور میرے ساتھیوں کے متعلق یا ان کی بیماریوں کے متعلق ہیں فیلڈ کیمپس کی زندگی میں

بھرے پڑے ہیں۔ ہر ایک کا تذکرہ اور تفصیل ممکن نہیں اور نہ ہی ضروری بھی ہے کیونکہ خواہ مخواہ کی طوالت نہ صرف طبیعت کو مکدّر کرتی ہے بلکہ بوریت پیدا ہونے کا سبب بھی بنتی ہے۔

ان چیدہ چیدہ واقعات کو سنانے کا مقصد سوائے اس حقیقت کے کہ مشکلات اور تکالیف میں ہوتے ہوئے آپ نے اپنا مقصدِ دوام حاصل کرنا ہے، بھرپور کامیابی حاصل کرنا ہے اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

باب ہفتم

# پُراسرار لوگ

وطنِ عزیز میں جہاں قدرت کی کارگزاریاں مختلف رعنائیوں کی شکل میں جگہ جگہ جمع موجود ہیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے شکرانے اور فکر انگیزی کی دعوت دیتی ہیں وہیں پر کچھ علاقے ایسے ہیں جہاں کے نفوس اپنی طرزِ زندگی، بودوباش، جسمانی خطوط اور نہ سمجھ آنے والی پُراسراریت کی بدولت کسی بھی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے ایک نارمل انسان کے لیے عجوبے سے کم نہیں۔

اپنی پیشہ ور ارضیاتی سروے والی نوکری کے دوران خاص طور پر لاہور آفس میں ٹرانسفر ہونے کے بعد خنجراب سے لے کر ساحلِ کراچی تک جن علاقوں میں سروے کی غرض سے جانے کا اتفاق ہوا وہاں پر کئی ایک علاقوں میں رہنے والے لوگ عام لوگوں کی نسبت غیر معمولی دکھائی دیے اور جب تک سائنسی عوامل کی گہرائی میں جا کر اصل وجوہ کی چھان بین کے نتیجے میں برآمد ہونے والی ممکنہ حقیقت سامنے نہ آئی تب تک ذہن حیرانی کے سمندر میں پریشان

رہا۔ ان علاقوں میں چند علاقے تو شمال مغربی پنجاب، پوٹھوار اور گلگت بلتستان کے ہیں جب کہ ایک آدھ میدانی علاقوں بالخصوص وسطی پنجاب سے متعلق ہیں۔

## سخرا گاؤں متصل ڈھوک مغلاں ڈسٹرکٹ جہلم

یہ علاقہ ترکی ٹول پلازہ کے مغرب کی طرف تقریباً 8 یا 10 کلومیٹر کی مسافت میں جی ٹی روڈ ضلع جہلم میں واقع ہے۔ اگر آپ لاہور سے راولپنڈی جا رہے ہوں تو جی ٹی روڈ سے گزرتے ہوئے ترکی ٹول پلازہ کے دونوں اطراف چونے کے پہاڑ جو گہرے سبزے سے ڈھکے ہوئے ہیں نظر آئیں گے۔ ان چونے کے پہاڑوں کے نیچے راولپنڈی گروپ کے پہاڑی سلسلے ہیں جنھیں نقشے پر نشانی کے طور پر ترکی ٹول پلازہ مارک کیا گیا ہے۔ ویسے ہمارا گزر اس کے جنوب مغربی گزر گاہ جو سوہاوہ شہر کی طرف واقع ہے وہاں سے ہوا۔ جب ہم سخرا گاؤں میں پہنچے تو کچھ دیر کے لیے سستانے کی غرض سے وہاں پر بچھی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ ایک تو مقصد اس عارضی آرام کا یہ تھا کہ اپنے آپ کو نقشے کے مطابق Locate کر لیں دوسرا فیلڈ سٹاف نے سائنسی اور دوسرے آلات کو ترتیب میں لانا تھا۔ جب تک فیلڈ سٹاف یہ کام سرانجام دیتا ہم نے مقامی لوگوں سے کچھ گپ شپ کی خاطر اور کچھ گرد و نواح کی معلومات کی خاطر ان سے حالات و واقعات کے متعلق آگاہی حاصل کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ہمارے گروپ لیڈر جناب ظفر اقبال صاحب تھے جو اس جیو کیمیکل سروے کے ماہر تھے، اس لیے ہم انتہائی مؤدبانہ انداز میں جناب ظفر اقبال صاحب کی گفتگو، حرکات و سکنات اور مقامی لوگوں سے طرزِ

معاملات کو بغور مشاہدہ دیکھتے اور سنتے رہے۔ اسی عمل کے دوران آہستہ آہستہ مقامی لوگ اکٹھے ہونا شروع ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی اچھی خاصی تعداد ہمارے ارد گرد جمع ہو گئی۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد جب نمونہ جات اکٹھے کرنے اور کچھ ایک کو وہیں فیلڈ پر سپاٹ ٹیسٹ کرنے کے لیے فیلڈ سٹاف اور ہم لوگ تیار ہو گئے تو دفعتاً میری نظر ان لوگوں کے چہروں اور ان لوگوں کی جلدی کیفیت Skin Condition جس میں انتہائی گہری پیلی رنگت بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ہلدی کے رنگ سے ملتی جلتی رنگت، کھردرے پن کے اور کھردرا پن بھی ایسا کہ دور سے ہی نظر آجائے، پر پڑی۔ میں بے حد حیران ہوا کہ یہ علاقہ ضلع جہلم کے نزدیک ہی ہے اور ذرا مغرب کی طرف جہاں سے ہم اندر داخل ہوتے ہیں۔ وہاں پر بہترین زرعی زمین اور ان پر لہلہاتی فصلیں وہاں کے لوگوں کی خوردونوش اور تجارت کی غرض و غایت کو اچھے خاصے منافع کے ساتھ پورا کرتی ہیں جن کی وجہ سے ارد گرد کے رہائشی بالکل نارمل جسم و جان کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں اور کوئی بھی مقیم کسی قسم کی جسمانی اور طبعی کمی کے باعث ایسی پُراسراریت کا شکار نہیں تو یہ لوگ کیوں اس طرح کی جسمانی اور طبعی پیچیدگیوں کا شکار ہیں۔ ایسے بے شمار سوالات ذہن میں پیدا ہونے شروع ہو گئے جو بعد میں مزید بڑھتے گئے اور ہم لوگ وہاں پر نمونوں کے ٹیسٹ کرنے کے ساتھ ساتھ مقامی لوگوں کی پُراسرار زندگی جو وہ گزار رہے تھے اور جس کے نتیجے کے طور پر ان کی جسمانی حالت بے حد بگڑی ہوئی تھی، پر زیادہ غور کرنے لگ گئے۔

میں نے ذرا نزدیک ہو کر ان لوگوں کی جلدی حالت اور رنگ کا معائنہ کرنا شروع کر دیا تو آہستہ آہستہ مزید انکشافات ہونے شروع ہو گئے۔ ان کے چہرے اور جسم کے باقی حصے بھی جلد کے کھردرے پن کا شکار دکھائی دیے۔ جلدی رنگ Skin Colour سب کے ہلدی نما پیلے تھے اور مزید انکشاف کہ یہ تقریباً دو سو گھرانے پر مشتمل ایک گاؤں ہے جہاں پر ایک ہی خاندان کے لوگ رہ رہے ہیں اور یہ یہاں سے باہر نہیں جاتے، یہ مقامی طور پر کچھ اشیاء جن میں سوتی ریشے سے تیار کردہ رسی اور گھروں کے استعمال کی دیسی اشیاء شامل ہیں بنا کر بیچتے ہیں یا موسمی بارشوں کے طفیل تھوڑی بہت زراعت پر گزارا کرتے ہیں۔ شادیاں اپنے ہی خاندان میں ہوتی ہیں جو نسل در نسل چلتی ہیں اور چلتی آ رہی تھیں۔ پہلے پہل یہاں ایک کنواں تھا جو بعد میں کہیں یونین کونسل کی کوششوں سے واٹر ہینڈ پمپ میں بدل دیا گیا اور اب یہ لوگ یہاں کے واٹر ہینڈ پمپ سے بر آمد پانی پیتے ہیں اور اپنی دوسری ضروریات پوری کرتے ہیں۔

اسی دوران پانی کے نمونہ جات جو اکٹھے کیے گئے تھے، ان کا فیلڈ ٹیسٹ تجزیہ کرنے والے فیلڈ سٹاف اور آفیسر نے انکشاف کیا کہ یہاں کے واٹر ہینڈ پمپ کا پانی جو پورا گاؤں پینے کے لیے استعمال کرتا ہے وہ انتہائی مضر صحت ہے اور مضر رساں کیمیکل اجزاء سے بھرپور ہے۔ مثلاً ایک تو اس کی PH دوسرا TDS اور سب سے بڑھ کر یورینیم کی حل شدہ مقدار نارمل مقدار سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس علاقے کی واٹر ٹیبل ہر طرف سے مختلف رکاوٹوں سے گھری ہوئی ہے اس لیے

یہاں کا پانی ہر طرح کے مضر صحت اجزاء سے بھرپور ہے اور اپنی مقدار میں بھی کم ہے۔ جب کبھی بارش ہوتی ہے تو اس گاؤں کی واٹر ٹیبل کی سطح بڑھ جاتی ہے اور پانی کی خاصیت کسی حد تک قابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔ ایک اور اہم بات جو مشاہدے میں آئی وہ یہاں کے لوگوں کی صحت کے بارے میں تھی یعنی اوّل تو یہاں خوراک کی بہت کمی تھی یا ان کو خوراک لگتی ہی نہیں تھی۔ زیادہ تر انتہائی دبلے پتلے جسم و جان کے مالک افراد تھے۔ جب ان سے استفسار کیا گیا کہ یہاں پر رہائش رکھنے کے حالات سازگار نہیں تو آپ لوگ یہ علاقہ چھوڑ دیں اور کہیں باہر نکل جائیں تو ان کا جواب تھا کہ ہم لوگ صدیوں سے یہاں رہ رہے ہیں، اس لیے ہم یہ جگہ نہیں چھوڑ سکتے اور ویسے بھی ہمیں اپنے بزرگوں کا حکم ہے کہ چاہے جو مرضی ہو جائے اس جگہ کو قطعاً نہیں چھوڑنا۔ یہاں کا قیام جو شیڈول کے مطابق زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے کا تھا وہ اس صورتِ احوال میں اڑھائی تین گھنٹے کا ہو گیا۔ بہر حال حیرانگی میں اس جگہ اور اس کے باسیوں کو چھوڑ کر ہم اگلے تجزیاتی سٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔

## سرائے میانی ضلع خوشاب

اسی طرح کا ایک علاقہ ضلع خوشاب میں واقع سکیسر ٹاپ جہاں پاک فضائیہ کا ریڈار سسٹم قائم ہے اس کے جنوب مغربی سمت میں تقریباً دو سو گھرانوں پر مشتمل ایک گاؤں کی شکل میں موجود ہے۔ غالباً 2009 میں اس جگہ کا پیدل ارضیاتی سروے کرنے کے دوران یہاں کے باسیوں کے بارے میں آگاہی ہوئی۔

یہاں بھی پیدل سروے کے دوران جب تھوڑا آرام کی غرض اور ایک دو گھونٹ پانی پینے کے لیے حمزہ صاحب اور میں رکے تو ایک بڑی سی چارپائی بچھی ہوئی دیکھی لیکن کوئی اچھی حالت میں نہ تھی۔ ساتھ ہی ایک بورڈ لگا تھا جس پر جلی حروف میں سمیرا ملک ممبر قومی اسمبلی لکھا تھا اور ساتھ ہی کوئی ترقیاتی کام کے بارے میں تحریر تھا۔ ماحول میں ایک عجیب قسم کی سختی، گراوٹ یا یوں سمجھ لیں افسردگی طاری ہوئی تھی۔ بقول حمزہ صاحب کے یہاں پر انھوں نے ایک دو پوائنٹ اپنے مطلوبہ معدن کے دریافت کیے تھے اور ان کے بارے میں تفصیلی نوٹ وغیرہ تحریر کرنے تھے۔ اسی دوران کچھ لوگ ہمارے نزدیک آ گئے اور پوچھنے پر بتانے لگے کہ وہ اس گاؤں کے ہیں اور اس بارے میں اگر کوئی آگاہی چاہیے تو ہم حاضر ہیں۔ تھوڑی گفتگو کے بعد حسبِ عادت میں نے ان لوگوں کے بود باش، مشاغل اور کام کاج کے حوالے سے کریدنا شروع کیا تو حیرت زدہ رہ گیا کہ یہ بھی سخرا گاؤں کے لوگوں کی طرح کا کیس ہے۔ ان لوگوں کی ظاہری حالت سخرا گاؤں کے لوگوں سے بھی بری تھی۔ جلد کا رنگ سیاہی مائل اور جسم انتہائی کمزور اور لاغر علاوہ ازیں چہرے مرجھائے ہوئے اور سب سے حیران کن بات یہ کہ بازو اور ٹانگیں پتلی پتلی اور کوئی بھی ایسا شخص نہ تھا جس کی ایک بازو یا ٹانگ ابنارمل نہ ہو۔ کوئی نہ کوئی عضو ٹیڑھا ضرور تھا۔ اکثر لوگ سمجھ لیں کہ ٹیڑھے میڑھے تھے۔ مجھے داستان امیر حمزہ جو بچپن میں کئی بار پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا اس کے مختلف کردار خاص کر امیر حمزہ اور عمرو عیار یاد آ گئے جو اکثر اوقات کسی نہ کسی

غیر معمولی علاقے یا جزیرے میں پہنچ جاتے اور وہاں کے رہائشی نفوس کے عجیب الخلقت اور جسمانی حالت کو بیان کرتے اور ان میں پائی جانے والی خصلتیں جو زیادہ تر منفی حرکات پر مبنی ہوتیں بیان کرتے۔ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ فضا میں عجیب طرح کی افسردگی چھائی ہوئی محسوس ہوئی اور وہ کہیں بڑھ کر ان لوگوں کے جسمانی نقائص اور گفت و شنید میں پائی گئی۔ اب پھر وہی معاملہ کہ ان لوگوں کی اس حالت کی وجوہات کیا ہیں تو وہی ایک تو کزن میرج، جو مرضی ہو جائے ان لوگوں نے اپنے بچوں کی شادیاں اپنے خاندان سے باہر نہیں کرنیں اور نہ ہی یہ جگہ چھوڑنی ہے کیوں کہ ان کے بھی آباواجداد اور بزرگان نے سختی سے منع کیا ہوا ہے کہ یہ جگہ نہیں چھوڑنی۔ اس کے علاوہ خوراک ان کی انتہائی واجبی سی، نہ کوئی ڈھنگ کا کام اور نہ ہی کوئی ایسا مشغلہ جو ان کی صحت کو تسلی بخش صورت سے ہمکنار کرے، بس لے دے کر ان کی ایک ہی قیمتی چیز ہے جو الیکشن کے دنوں میں یہاں کی مقامی لیڈر شپ چند ہزار روپوں یا ہینڈ پمپ اور کسی بھی عارضی نوعیت کی مدد ووٹ کے عوض حاصل کرتی ہے۔

اب جب اس علاقے کی معدنی دولت پر نظر ڈالیں تو اس گاؤں کے زیرِ زمین نمک اور جپسم کے ذخائر موجود ہیں، کہیں کہیں کوئلے کی کانیں بھی موجود ہیں۔ اصل میں یہ وہی بیلٹ ہے جو کھیوڑہ سے آتی ہے اور یہاں سے گزر کر میانوالی، سکندر آباد جیسے ویسٹرن سالٹ رینج (W.S.R) کہا جاتا ہے، پہنچتی ہے۔ یہاں پر بھی پانی کی عارضی واٹر ٹیبل ہے جو زیر زمین نمک اور جپسم سے

متاثر ہے اور پینے کے پانی کو مضر بناتی ہے۔ یہی پانی یہاں کے باشندے استعمال میں لانے پر مجبور ہیں اور نتیجتاً ان کی جسمانی ہیئت و ساخت میں خرابی کی ذمہ دار ہے۔

باقی ان کے مڑے تڑے جسمانی اعضاء کی طرف غور کیا جائے تو یہاں کے پانی میں آئیوڈین کی بھی کمی پائی جاتی ہے اور یہ آئیوڈین کی کمی تو ویسے پورے پوٹھوار پلیٹو میں مقامی عورتوں میں بالخصوص گلہڑ کی شکل میں واضح ہوتی ہے۔

## ماروز، سونی وال (سونے کے شکاری)

یہ قوم جو پیشہ ور سونے کی شکاری اور عرف عام میں ماروز یا سونی وال کہلاتی ہے، پچھلے کئی سو سالوں سے گلگت بلتستان میں پھیلے ہوئے دریاؤں بشمول دریائے سندھ، دریائے گلگت، دریائے ہنزہ، شگر، شیوک اور ان سے جڑی ہوئی چھوٹی بڑی تازہ پانی کی ندیوں کے کنارے ریت اور دریاؤں کی مٹی کو چھان کر ان میں سے سونے کے ذرات اکٹھے کرتی ہے۔ پہلے پہل جب منگلا اور تربیلا ڈیم نہیں بنے تھے تو اس وقت یہ سونے کے ذرات اپنی ملحقہ ریت اور مٹی کے ہمراہ پوٹھوار کے علاقے میں پائی جانے والی ندیوں مثلاً گھبیر اور سواں اور اس کے ساتھ منسلک ندیوں میں بھی پائے جاتے تھے لیکن ڈیم بننے سے اور پانی کے کم ہو جانے کی وجہ سے دریائے سندھ کی ریت اور مٹی یہاں تک آ کر رک گئی اس لیے یہاں پر ماروز لوگوں کا کام بھی ختم ہو گیا۔

2008–2009 کے فیلڈ دورانیے کے دوران مختلف معدنیات کے نمونہ جات اکٹھے کرنے کے عمل میں ان لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان دنوں ماروز

لوگ تھاکوٹ سے لے کر دریائے سندھ کے بالائی علاقوں تھور، چلاس، رائے کوٹ برج، گمبٹ، گلگت اور پھر شمال کی طرف دریائے گلگت اور اوپر یٰسین ویلی کی طرف اور گلگت سے مشرق کی طرف دریائے سندھ اور اوپر سکردو اور سکر دو سے شِگر، شیوک اور اولڈنگ کی اطراف پھیلے ہوئے دریاؤں اور ان کی ملحقہ ندیوں میں سونے کی تلاش کا کام کرتے نظر آتے اور کافی محنت و جستجو کے بعد اپنی روزی روٹی کا بندوبست کرتے دکھائی دیتے۔ ان کے طریقۂ تلاش کو کسی حد تک میں نے "جدوجہدِ زندگانی" (2023ء) میں بیان کیا ہے۔ اور یہ ماروز لوگ ابھی تک یہی کام کر رہے ہیں۔ ان لوگوں سے نزدیکی ملاقاتیں اور تبادلۂ خیالات ان دنوں ہوا جب ہم لوگ چلاس میں دریائے سندھ کے شمالی کنارے میں اپنی مطلوبہ معدن کو ریت سے کھنگال کر صاف کرنے کے عمل کے پراجیکٹ پر کام کر رہے تھے۔ یہ لوگ بظاہر بکھرے نظر آتے ہیں لیکن اپنے شکار کے دوران ہر شخص اپنا اپنا حصہ بقدر جثہ ضرور ڈالتا ہے۔ اب ان لوگوں کی شکل و صورت، جلدی رنگت، جسمانی اعضاء کی صحت اور مضبوطی، دماغی حالت اور خوراک پہلے سے بیان کردہ دونوں پُراسرار لوگوں سے کسی حد تک بہتر ہے۔ جسمانی نقائص سے پاک و مبرّا اور کام کاج سے والہانہ لگاؤ بھی ان کو ان لوگوں سے ممتاز کرتا ہے لیکن ایک بات بہت شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ ان کی جلد کی رنگت بھی صحت مند نہیں کہلا سکتی بلکہ اگر آسانی سے سمجھا جائے تو پیلی رنگت غالب نظر آتی ہے اور جلد کی حالت بھی کسی حد تک سخت اور کھردری۔ گو یہ بھی اپنے خاندان سے باہر شادی نہیں

کرتے لیکن یہ چونکہ ایک کثیر تعداد میں پورے گلگت بلتستان میں پھیلے ہوئے ہیں اس لیے ان کو ان مسائل سے واسطہ نہیں پڑتا جو کزن میرج کے مسائل کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔

اب رہی ان کی جلدی رنگت جو پیلی ہے تو اس کے بارے میں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ جب دریا کی ریت اور مٹی جو یہ منوں کے حساب سے اکٹھے کرتے ہیں اور بعد ازاں اپنے خود ساختہ اوزاروں کی مدد سے چھان پھٹک کے عمل کے بعد بمشکل ان کا وزن چند کلو گرام رہ جاتا ہے تو یہ مٹیریل جس میں سونے کے ذرات بھی اچھل کود رہے ہوتے ہیں دراصل ایک عرق کی شکل میں رہ جاتا ہے۔ اس عرق کا رنگ گہرا کالا ہوتا ہے کیوں کہ اس میں لوہے کے معدن کثیر تعداد میں ہوتے ہیں اور ساتھ ہی یورینیم اور تھوریم۔۔۔ کے ذرات بھی اچھی خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ یعنی تابکاری والے ذرات جن میں یہ تقریباً سارا سارا سال متعلّق رہتے ہیں، ان کی صحت و رنگت پر کچھ نہ کچھ اثر چھوڑتے ہیں جو اگلی نسلوں تک چلتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مختلف نسبتیں بناتے ہیں۔

باب ہشتم

# زندگی رُلاتی بھی ہے

## ایک ننھی پری کی شہادت

یہ دلخراش واقعہ اکتوبر 2004ء کا ہے جب ہم لوگوں نے کرک کے نزدیک لتمبر میں سروے کیمپ ترتیب دیا ہوا تھا۔ ہمارا سروے کیمپ بنوں لتمبر روڈ پر قیام پذیر تھا اور فیلڈ روانگی یا واپسی پر لتمبر گاؤں جو روڈ کے دونوں طرف آباد تھا گزرنا پڑتا تھا۔ ذرائع آمدورفت یقیناً فیلڈ جیپ یا ڈبل ڈور گاڑیاں ہوتی تھیں اس لیے لتمبر کے علاقہ سے گزرتے وقت انتہائی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ لوگ ٹریفک کے بہاؤ سے بے نیاز سڑک آر پار کرتے رہتے تھے اور خصوصاً بچے بھاگتے بھاگتے سڑک کو ایک طرف سے دوسری طرف کراس کرتے، اس لیے ہم سب لوگ یہاں سے گزرتے وقت بہت محتاط رہتے۔

ایک دن لاہور سے کچھ ضروری سٹور لے کر صبح 6 بجے سنگل کیبن گاڑی جس کو صدیق بٹ نامی ڈرائیور ڈرائیو کر رہا تھا مجھے لے کر روانہ ہوا۔ ہم تقریباً

10 بجے بلکسر پہنچ گئے اور حسب معمول وہاں سے چائے کا ایک ایک کپ نوش کیا۔ بعد ازاں میانوالی بائی پاس سے ہوتے ہوئے جنڈ شہر کو کراس کیا اور دریائے سندھ پر قدیم پل خوشحال گڑھ کراس کر کے گمبٹ پہنچ گئے۔ وہاں رکے اور وضو کر کے نمازِ ظہر ادا کی اور نماز پڑھنے کے بعد ایک بار پھر گاڑی اسٹارٹ کی اور تازہ دم ہو کر کوہاٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ کوہاٹ سے پھر بائی پاس ہوتے ہوئے کرک اور کرک سے بائی پاس راستہ اختیار کرتے ہوئے رحمت آباد تک بالکل بغیر کسی پریشانی اور تھکاوٹ کے پہنچ گئے۔ رحمت آباد کو کراس کرنے کے بعد ذہن میں یکا یک ایک خیال آیا کہ آج تو بہت اچھا دن رہا۔ خدانخواستہ کوئی مسئلہ ہمارے ساتھ یا گاڑی کے ساتھ درپیش نہیں ہوا۔ اسی دوران شکرانہ کے طور پر کچھ قرآنی آیات کو تلاوت کرنے لگا۔ ڈرائیور صدیق نے سورڈاگ موڑ سے گاڑی بائیں طرف لتمبر کی جانب موڑ لی اور گاڑی کی رفتار بھی کافی کم کر لی۔ سورواگ موڑ سے لتمبر گاؤں کوئی 4 یا 5 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اس دوران میں نے قرآنی آیات پڑھ لیں اور دعا میں مشغول ہو گیا۔ جیسے ہی لتمبر گاؤں کا بازار گزرنے لگا ایسا لگا کہ کوئی چیز گاڑی کی لپیٹ میں آگئی ہے اور گاڑی گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ رک گئی۔ ساتھ ہی صدیق ڈرائیور کی پریشانی میں ڈوبی ہوئی آواز اُبھری کہ سر کوئی بچہ گاڑی کے نیچے آگیا ہے۔ اتنا سننا تھا کہ میری جان ہی نکل گئی۔ فوراً گاڑی کا دروازہ کھولا اور نیچے اترا۔ اسی اثنا میں صدیق ڈرائیور ایک بچی کو گود میں اُٹھائے ہوئے نظر آیا۔ گاڑی وہیں رہی اور صدیق اور میں نزدیکی ہسپتال BHU

میں بھاگے۔ بچی انتہائی خوبصورت اور بمشکل 6 سال کی تھی۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور وہ خود بے ہوش تھی۔ BHU میں ڈاکٹر صاحب نہیں بلکہ ایک ڈسپنسر تھا۔ اس نے فوراً سر پر پٹی باندھ دی اور ہمیں کہا کہ اسے بنوں ڈسٹرکٹ ہسپتال لے جائیں۔ چنانچہ واپس گاڑی میں آئے۔ ساتھ ہی کیمپ تھا۔ میں نے صدیق ڈرائیور کو کہا کہ کیمپ انچارج ملک صاحب کو اطلاع دیتے جائیں کہ کیا ہوا ہے اور اب ہم کدھر جا رہے ہیں۔ دوسرا اگر ہجوم مشتعل ہو کر کیمپ کی طرف آتا ہے تو وہ معاملے کو سنبھال سکیں۔ اسی اثناء میں بچی کی ماں اور چچا بھی آ گئے تو انھوں نے بچی کو اپنے تصرف میں لے لیا اور صدیق ڈرائیور بوکھلاہٹ میں کیمپ کے اندر خون آلود کپڑوں سمیت چلا گیا۔ وہاں ملک صاحب نے جب اس کو خون آلود کپڑوں میں دیکھا تو سٹپٹا گئے اور بولے قریشی کو کیا ہوا ہے؟ وہ سمجھے کہ کوئی حادثہ ہو گیا ہے اور عباس قریشی اچھا خاصا زخمی ہو گیا ہے لیکن صدیق ڈرائیور نے فوراً ساری صورتِ احوال سمجھائی اور جلدی سے گاڑی میں سیٹ پر بیٹھ گیا۔ لیکن گاڑی اتنی سواریوں کے لیے ناکافی تھی۔ اس لیے شیر محمد (مرحوم) کی گاڑی نکالی جس میں کم از کم پانچ سواریاں آ سکتی تھیں۔ بنوں کے ڈسٹرکٹ ہسپتال میں پہنچتے پہنچتے تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا۔ وہاں ایمرجنسی میں بھاگم بھاگ پہنچے۔ خوش قسمتی سے ہمارے ساتھ ایک مقامی شخص بھی تھا۔ جس کا نام غالباً نجی اللہ تھا۔ جو انتہائی مددگار کے طور پر کام کر رہا تھا۔ بچی کے لواحقین اور ہمارے درمیان باقاعدہ ڈھال بنا ہوا تھا۔ ویسے قربان جائیں بچی کی والدہ اور چچا کے جنھوں نے اس جذباتی

اور ایمرجنسی صورتحال میں نہ صرف اپنے اوسان قائم رکھے بلکہ ہمیں بھی دلاسہ دیتے رہے۔

بچی کا خون کافی بہہ گیا تھا اور سر پر شدید چوٹیں بھی آئی تھیں۔ ڈاکٹروں نے اچھی طرح معائنہ کے بعد B+ خون کی ایک بوتل کا بندوبست کرنے کو کہا۔ میرا اپنا خون B+ ہے لہٰذا میں نے فوراً رضامندی ظاہر کی اور ایک عدد بیگ میرے خون سے بھر کے بچی کو لگا دیا گیا۔ بچی ابھی تک ہوش میں نہیں آئی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ڈاکٹروں نے کہا کہ بچی کا CT سکین ہونا ہے جو پشاور کے بڑے ہسپتال میں ممکن ہے لہٰذا آپ بچی کو پشاور لے جائیں۔ ہم سب لوگ دوبارہ گاڑی میں بیٹھے اور پشاور کی طرف روانہ ہو گئے۔ پورے راستے میں دل گرفتہ و پریشانی میں ہوش و حواس سے بے گانہ بار بار بچی کی صورت اور حالت کچوکے لگا رہی تھی اور اس بچی کی بے بس اور لاچار ماں اور چچا سے بلکہ پورے لتمبر گاؤں والوں سے شرمندگی ہو رہی تھی۔ صبح کا آغاز اور رودادِ سفر جب تک یہ حادثہ نہیں ہوا تھا، ایک ایک کر کے یاد آ رہے تھے۔ غلطی کہاں ہوئی؟ کہاں غیر ضروری طور پر رکے رہے؟ یا کہاں سے جلدی روانہ ہوئے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن پورے راستے میں کوئی بھی ایسی غیر معمولی جلدی یا سستی ذہن میں نہ آئی جس کو اس حادثہ کی وجہ بنایا جاتا۔ ہر ہر حرکت بالکل وقت کے ساتھ تسبیح کے دانوں کی طرح پروئی ہوئی تھی۔ ذہن انتہائی انتشاری کیفیت میں مبتلا تھا کہ کوہاٹ ٹنل آ گئی۔ کوہاٹ ٹنل کوئی پونے دو کلومیٹر طویل ہے اور اس وقت جاپانیوں کے اشتراک سے نئی

نئ مکمل ہوئی تھی۔ کوہاٹ ٹنل سے باہر نکلتے ہی پشاور شہر کے آثار شروع ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ذہن وزبان پر بچی کے متعلق اس کی زندگی کے واسطے اللہ تعالیٰ کے حضور دعاؤں پر دعائیں نکل رہی تھیں کہ اچانک بچی کا چچا بولا، گاڑی واپس موڑ لیں کیونکہ بچی اللہ کو پیاری ہو گئی ہے۔ ذہن میں یکایک اندھیر گھپ گھیر کے جھونکے آنے شروع ہو گئے۔ کانوں میں سیٹیاں بجنا شروع ہو گئیں اور دل بالکل مرجھا گیا۔ لیکن بچی کی والدہ اور چچا دونوں نے اونچی آواز میں انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا تو مجھے بھی ہوش آ گیا۔ میں نے ان کے ساتھ ہی کلمہ دہرایا اور مجھے نہیں یاد کہ میں نے کوئی اور بات کی ہو۔ دماغ سُن ہو کر رہ گیا اور جسم نے تقریباً جان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ بہر حال شیر محمد (مرحوم) نے گاڑی کو ٹنل سے باہر نکالا اور ساتھ ہی ٹرن لے کر ٹنل کے واپسی راستہ کی طرف موڑ دیا۔ ٹنل سے گاڑی نکال کر جیسے ہی ہم کوہاٹ بائی پاس پر چڑھے تو بچی کے چچا نے کہا، آپ صبح سے سفر میں ہیں اور دوسرا یہ صدمہ جھیل رہے ہیں، یہاں قریب ہی چائے کا کھوکھا ہے چلیں وہاں چائے کا ایک ایک کپ نوش کرتے ہیں اور تازہ دم ہوتے ہیں۔ یہ بات جب اس شخص نے کی تو میں خیالات کی دنیا سے یکایک باہر نکلا اور اس کو ایسے دیکھنے لگا جیسے یہ کوئی فرشتہ ہے یا کوئی اللہ کا ولی ہے۔ جو بات میرے وہم و گمان میں ڈر، خوف اور شرمندگی کی وجہ سے نہیں آ رہی تھی وہ اس بچی کے چچا نے انتہائی دلیری، خلوص اور خالص مومن انداز میں کی، میں نے اپنا قد مزید چھوٹا محسوس کرنا شروع کر دیا۔ ایک تو ہماری وجہ سے ان کے جگر کا ٹکڑا اِس حالت میں

پہنچا اور دوسرا یہ کہ بجائے ہمیں لتاڑنے یا ہم پر غصہ کرنے کے یہ لوگ اس حالت میں بھی اپنی مروت اور میزبانی کو نہیں بھولے اور برابر ہمیں اس بات کا احساس دلا رہے ہیں کہ بس ہمیشہ رہنے والی وہ خدا کی ذات ہے۔ بہر حال شیر محمد (مرحوم) نے گاڑی ایک چھوٹے سے ریستوران پر روکی اور چائے پانی کا بندوبست شروع ہوا۔ نجی اللہ ایک باہمت اور معاملہ فہم جوان آدمی تھا۔ یہ شروع سے ہی ہمارے ساتھ فیلڈ اور کیمپ میں فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ وہ مجھے چائے پیتے ہوئے الگ سے ایک طرف لے گیا اور کہنے لگا یہ لوگ ایسے معاملات کو دو طریقوں سے سرانجام پہنچاتے ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ دشمنی پیدا کر لی جاتی اور پھر اس دشمنی کو نسلوں تک کھینچا جائے۔ دوسرا یہ کہ معافی والا معاملہ ہو جائے۔ آپ چونکہ پردیسی ہیں اور آپ کے ساتھ ان لوگوں کا دشمنی والا معاملہ کوئی نہیں ہے اس لیے امید کی جاسکتی ہے کہ اگر آپ ان سے ان کے گھر جا کر تمام اہلیانِ گاؤں کی موجودگی میں معافی کے درخواستگار بنیں تو یہ آپ کو معاف کر دیں گے اور کسی قسم کی کوئی قانونی یا معاشرتی کارروائی نہیں کریں گے۔ ڈرائیور صدیق بھی کافی خستہ حال ہو رہا تھا۔ اس نے جب یہ مشورہ سنا تو فوراً گھگھیائے انداز میں نجی اللہ سے بولا کہ نجی اللہ بھائی میری معافی کروا دیں۔ کسی بھی طرح سے میں پچاس ہزار روپے تک کا خرچہ کر سکتا ہوں۔ اس کی اتنی پتلی حالت پر تقریباً ہر ایک کو ترس آ رہا تھا۔ چنانچہ نجی اللہ نے ہماری طرف سے نمائندگی کا حق ادا کرتے ہوئے حامی بھر لی کہ میں کچھ کرتا ہوں۔

بوجھل دل سے ہم لوگ رات کے تقریباً 2 بجے لتمبر پہنچے۔ بچی کی میت اور اس کی والدہ بمعہ اس کے چچا اور کچھ اور لوگوں کے جو ہمارے ساتھ تھے۔ ان کو ان کے گھروں میں اتارا اور خود ایک ہارے ہوئے شخص کی طرح کیمپ میں داخل ہوئے۔ جناب ظفر اقبال صاحب جاگ رہے تھے۔ فوراً پوچھا، کیا ہوا؟ میں نے بتایا کہ بچی غریقِ رحمت ہو گئی ہے۔ فوراً بولے، اناللہ و انا الیہ راجعون۔ اور کہنے لگے اب تم سو جاؤ۔ جو قسمت میں لکھا تھا وہ ہو گیا۔ اب سب کچھ صبح ہو گا اور اللہ مہربانی فرمائے گا۔

بہر حال کسی بھی طرح میں نے منہ ہاتھ دھویا، عشاء کی نماز پڑھی اور بستر پر لیٹ گیا۔ نیند نے کب مجھ پر رحم اور ترس کھایا کچھ یاد نہیں۔ صبح مؤذن کی آواز نے فجر کی نماز کے لیے اٹھایا۔ وضو کر کے نمازِ فجر ادا کی اور اللہ سے رحم کی بھیک مانگی۔ تھوڑی دیر کے بعد نجی اللہ کیمپ میں آ گیا اور معاملہ کو افہام و تفہیم کے ذریعے حل کرنے کی کوششوں سے آگاہ کرنے لگا۔

اس علاقہ میں معافی اور صلح جوئی کا ایک طریقہ کار ہے جو عرصہ دراز سے چل رہا ہے۔ بقول نجی اللہ کے بچی کے لواحقین اور اہل گاؤں وغیرہ سے معافی مانگنے اور یقینی بچت کا طریقہ یہ ہے کہ روزمرہ استعمال والی کھانے پینے کی اشیاء اور پھل وغیرہ لے کر متاثرہ گھر جایا جائے اور یہ اشیاء ان کو نذرانہ کے طور پر پیش کی جائیں۔ قبولیت کی صورت میں باقاعدہ اپنے کیے پر شرمندگی کا اظہار کر کے معافی کی درخواست کی جائے۔

مسئلے کا یہ حل جب صدیق ڈرائیور کو بتایا تو وہ ایک دم سیدھا ہو گیا، بولا مجھے تو انھوں نے رات کو ہی معاف کر دیا تھا۔ میں کیوں اب یہ نذرانہ خریدوں۔ میں نے کوئی خرچہ ورچہ نہیں کرنا۔ نجی اللہ اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا نجی اللہ بے فکر ہو جاؤ یہ سارا خرچہ میں کرتا ہوں۔ اس کو چھوڑو۔ چنانچہ میں اور نجی اللہ پاس والے بازار میں گئے اور وہاں سے گھی کا ایک کنستر، 5 کلو پیاز، 10 کلو چاول اور اتنا ہی آٹا، ساتھ چائے کے ڈبے، چینی 5 کلو اور جو بھی اشیاء وہاں با آسانی دستیاب تھیں، ہم نے خریدیں اور اس وقت یہ سارا خرچہ تقریباً پانچ ہزار روپے ہوا۔ بہر حال ہم نے گاڑی میں سارا سامان رکھا اور اپنے ہمراہ صدیق ڈرائیور، نجی اللہ اور شاید ایک آدھ اور اسٹاف کا ممبر لیا اور اللہ کا نام لے کر متاثرہ گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

جیسے جیسے گھر نزدیک آرہا تھا ویسے ویسے دل کی دھڑکن تیز اور بے ترتیب ہو رہی تھی۔ نہ جانے کتنے ہی خیالات تھے جو اس نا قبولیت کے نتیجہ میں پنہاں تھے اور ممکنہ شرمندگی، بے عزتی اور لاچاری کے بارے میں خوف زدہ کر رہے تھے۔ ایک اللہ کی ذات ہی تھی جو اس امتحان میں بھی ساتھ تھی اور اپنے رحیم و کریم ہونے کا احساس کروا کر دل کو ڈھارس بندھوا رہی تھی۔

جیسے ہی گاڑی متاثرہ گھر کے نزدیک پہنچی وہاں کم و بیش ساٹھ یا ستر اشخاص جو زیادہ تر روایتی ہتھیاروں سے مسلح تھے اور انگریزی کے حرف U کی ترتیب سے بچھائی چارپائیوں پر براجمان تھے۔ ان کی اس ترتیب میں اور مسلح حالت میں دیکھ

کر دل کی بے ترتیب دھڑکن میں مزید اضافہ ہو گیا اور اللہ تبارک تعالیٰ کے سوا کسی قسم کا کوئی آسرا دکھائی نہ دیا۔

بہر حال گاڑی متاثرہ گھر کے سامنے رو کی گئی اور میں نے جی کڑا کر کے سارے مجمع کو السلام علیکم با آواز بلند کہا اور جواب میں وعلیکم السلام جس تیزی اور بلند آواز میں آیا تو ایک ڈھارس سی بندھ گئی۔ مزاج میں کچھ تراوٹ محسوس ہوئی۔ حوصلہ بڑھا اور سارے مجمع کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا تعارف کروایا اور جو کچھ پچھلی شام کو ہوا تھا اس پر نادم اور شرمندہ ہو کر نہایت پُر سوز انداز میں چند جملے ادا کیے جو یوں تھے:-

'ہم پردیسی لوگ ہیں، ہمارا آپ کے ساتھ سوائے دین کے اور ایک ہی ملک کے باسی ہونے کے اور کوئی رشتہ، ساجھے داری یا اختلاف نہیں۔ جو کچھ بھی ہوا اُس میں ہمارا خدانخواستہ کوئی بھی شعوری یا دانستگی والا ہاتھ نہیں۔ ہمیں اتنی عقل نہیں کہ ہم ٹھیک طرح سے آپ لوگوں سے معافی بھی مانگ سکیں۔ ہم یہاں اللہ گواہ ہے صرف اور صرف اس علاقے اور یہاں کے بسنے والوں کے بہترین مستقبل کی خاطر اپنے گھروں سے بے گھر ہو کر چوبیس گھنٹے پہاڑوں کی خاک چھان رہے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ اس کے ہمیں پیسے بھی ملتے ہیں لیکن اس بات سے کہیں زیادہ ہماری کامیابی اس علاقے کے مستقبل اور یہاں کے رہنے والوں

کی مالی حالت کی درستگی میں معاون ہوتی ہے جیسا کہ دوسرے
علاقوں میں اللہ نے ہمیں کامیابی دی ہے۔'

جیسے جیسے میں بات آگے بڑھا رہا تھا ویسے ویسے میری باتوں کا اثر ان لوگوں کے ہمہ تن گوش ہو کر سننے اور چہروں کے تاثرات سے عیاں ہو رہا تھا۔ کچھ مزید ڈھارس بڑھنے کے ساتھ ہی میں نے بچی کے چچا اور اس کے باپ کو بھی دیکھ لیا۔ پھر میری باتوں اور چہرے کا رخ ان کی طرف رہا اور اللہ کی نصرت آتی صاف نظر آئی۔ ابھی میں تقریر کر رہا تھا کہ ایک دم سارا مجمع کھڑا ہو گیا اور گھر کے دروازے سے برآمد ہونے والی ایک بزرگ عورت کو دیکھنے لگ گیا۔ وہ بزرگ عورت 80 برس یا اس سے زائد عمر کی ہو گی۔ چہرہ سارا جھریوں سے بھرا ہوا تھا جو اس بات کا غماز تھا کہ اماں جی نے زندگی کی رعنائیوں اور سختیوں کو خوب دیکھا ہے اور برداشت کیا ہے۔ اماں جی کے دونوں کانوں میں بڑے سائز کے چاندی کے چھلے تھے اور روایتی لباس میں ملبوس اس علاقے کی تہذیب و تمدن کا پتا دیتے تھے۔

اماں جی جو شہید بچی کی دادی تھیں نے اپنے کسی بیٹے یا پوتے کا سہارا لیا ہوا تھا اور میری طرف بتدریج قدم بڑھا رہی تھیں۔ جیسے ہی میرے پاس آئیں، میں نے مجمع سے کلام ترک کیا اور ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میرے پاس آکر بولیں، کون تھا جس نے میری بچی کو اٹھایا تھا اور خون دیا تھا۔ بتانے والے نے میری طرف اشارہ کیا تو اماں جی نے والہانہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھوں سے میرے

چہرے کو پکڑا اور میرے ماتھے پر بوسہ دیا اور یہ عمل کافی دفعہ دہرایا۔

اماں جی کا یہ انداز اور مجھے نہایت پیار کے ساتھ بوسہ دینا ان کی آنکھوں کی چمک کے ساتھ امڈتی نچھاور کرتی ہوئی محبت نے ایسا کام کر دکھایا کہ جہاں میں پریشانی اور امید کے درمیان والی گومگوں حالت میں گرتا سنبھلتا تھا، وہاں یکایک ایک مضبوط اور توانا سہارا میسر آگیا۔ اللہ تعالیٰ نے عین اپنی سنت کے مطابق خوف و دہشت کی فضا کو غائب کر کے امن و آشتی کی فضا قائم کر دی اور اماں جی جیسی فرشتہ سیرت شخصیت کے دل میں میری قدر و منزلت بنا کر سارا منظر میری حمایت میں کر دیا۔

اماں جی کے اس پُر شفقت رویے نے میرے جذبات کو بھی پروان چڑھایا اور میں اس ننھی پری کی شہادت پر آنکھوں میں آنسو روک نہ سکا اور خوب جی بھر کر رم جھم برسات برسی۔ پنڈال کی تمام فضا ہمارے حق میں ہو گئی اور بچی کے باپ نے برملا کہا کہ ہم نے آپ کو قطعاً معاف کیا، آپ کا اس معاملہ میں دانستہ یا غیر دانستہ کوئی قصور نہیں۔ قصہ مختصر اس تقریبِ معافی کے بعد ہم سب لوگ اس ننھی پری کی آخری آرام گاہ پہنچے جو ساتھ ہی واقع قبرستان میں محوِ آرام تھی۔ وہاں فاتحہ پڑھی اور دعائے خیر کی اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کیمپ میں واپس آئے۔

جیسے ہی کیمپ کی حدود میں داخل ہوئے، سیدے خان ڈرائیور نے صدیق بٹ کو ہنستے مسکراتے ہوئے دیکھا تو بولا، اللہ کی قسم ہمارے افسران ہی اعلیٰ ہیں۔ اس بات کی سمجھ مجھے اس وقت قطعاً نہیں آئی۔

# شہداءجیالوجی

ایک جیالوجسٹ کی پیشہ ورزندگی جہاں قدرت کی کارگزاری اور تخلیقات کوخود اپنی نگاہوں سے غور سے، تفصیل سے اور گہرائی سے مشاہدہ کرتی ہے شاید ہی کوئی اور ذریعہ ہو جہاں قدرت اتنی نزدیک سے دِکھتی ہو۔ جہاں جیالوجسٹ پہنچتاہے وہاں دوسرا کوئی پیشہ ور جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ پہاڑ کی چوٹی ہو یادامن ہو، پہاڑ اپنے اندر ایک مکمل دنیا آباد کیے ہوتا ہے جہاں آپ کو عجیب الخلقت جانور جن میں درند، چرند اور پرند شامل ہیں میدانی علاقہ کی نسبت ذرا مختلف طرزِ اشکال اور طرزِ زندگی بسر کرتے ہوئے ملتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ کچھ عوامل اور واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے بارے میں سوچنا تو درکنار اگر معرضِ وجود میں آجائیں توان کاذکر طبیعت پر انتہائی گراں گزرتا ہے۔

ایسے ہی ایک دلخراش اور المناک واقعہ کا ذکر کرنے لگا ہوں جو ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی اور حکم، اور جس سے تجاوز کسی مخلوق کو نہیں لیکن انسان جیسی کمزور مخلوق کے لیے ایسے سانحات کو سہنا اور برداشت کرنا ممکن نہیں، جب تک اللہ تبارک وتعالیٰ کی مہربانی اور شفقت نہ ہو۔

یہ واقعہ 2006ءکے مون سون کا ہے اور KPK کے کرک ڈویژن کا۔ ہمارے ادارے کا ایک سروے کیمپ بانڈہ داود شاہ میں قیام پذیر تھا جو شمال مغرب اور مغرب کے علاقہ جات اور پہاڑی علاقوں کا سروے کرنے پر مامور تھا۔ اس کیمپ میں بھی کچھ سائنٹسٹ اور سپورٹنگ سٹاف ڈیلی ویجر رکھے گئے تھے۔

ایک لڑکا جو ابھی تازہ تازہ ایم ایس جیالوجی کر کے پنجاب یونیورسٹی سے آیا تھا وہ بھی اس گروپ میں شامل تھا۔ اس لڑکے کا نام طارق عزیز تھا اور تعلق میاں چنوں کے علاقے سے تھا۔ طارق عزیز انتہائی گوراچٹا خوبصورت جوان تھا اور صوم وصلوٰۃ کا پابند، شرعی داڑھی اس کے چہرے پر بہت پھبتی تھی۔ عادات و اخلاقِ حسنہ کی دولت سے بھی خوب مالا مال تھا اور انتہائی ادب سے دھیمی گفتگو کرنے کا عادی تھا۔ ساتھ ساتھ اس کو کام سیکھنے کا بھی بہت شوق تھا اس لیے میرا جب بھی کوہاٹ کیمپ میں جانا ہوتا تو کھانے کی میز پر ملاقات کے دوران وہ میرے تجربات سے فائدہ اٹھانے کے لیے سوال وجواب کرتا لیکن انتہائی مؤدب ہو کر۔ اگر کسی مسئلہ کی سمجھ نہ بھی آتی تو باادب ہو کر دوبارہ اس طرح سے دریافت کرتا کہ میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس کو نئے سرے سے پوری بات سمجھانے کی کوشش کرتا۔ وہ میرے ساتھ اتنی مروّت، خوش اخلاقی اور احترام سے ملتا کہ مجھے شرمندگی محسوس ہوتی اور میں اسے کہتا ہی رہتا کہ طارق صاحب مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھ لیں لیکن پیر و مرشد کا درجہ نہ دیں، نہ میں اس کے قابل ہوں۔ غرضیکہ طارق عزیز (مرحوم) ہر معاملے میں ایک ہونہار جیالوجسٹ تھا جس کا مستقبل بہت روشن دکھائی دیتا تھا۔

پیدل سروے کے دوران ہم لوگ بارش میں کام کرنے سے اجتناب کرتے تھے کیونکہ ایک تو بارش کا موسم پہاڑی علاقہ میں نسبتاً خطرناک ہو جاتا تھا اور پیدل چلنا دشوار، دوسرا برقی آلات ہمراہ ہوتے تو اُن کے خراب ہونے کا

اندیشہ بھی لاحق رہتا۔ یہ شاید جولائی 2006 کا آخری عشرہ یا اگست کا پہلا ہفتہ تھا جب صبح کے وقت ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوئی اور کچھ دیر کے بعد تھم گئی۔ کیمپ کے لڑکوں نے سوچا کہ اب شاید بارش نہ ہو اس لیے جیپ میں بیٹھے اور فیلڈ سروے کے لیے نکل گئے۔ کوہاٹ سے براستہ بانڈہ داود شاہ ٹیری سے میاں جی خیل اور آگے گرگری کا علاقہ ہے۔ سارا دن گرگری کے پہاڑی علاقے میں سروے کرتے رہے اور بعد ازاں وقتِ مقررہ پر واپسی کے لیے تیار ہو گئے۔ واپسی کے دوران ایک بار پھر بادل آ گئے اور ہلکی ہلکی پھوار برسنے لگی جو دیکھتے ہی دیکھتے ہلکی بارش میں بدل گئی۔ جب بارش میں ذرا تیزی آئی تو اس وقت تک یہ لوگ گرگری اور میاں جی خیل کے درمیان نشیبی علاقہ میں تھے۔ پہاڑی علاقہ میں بارش ایک تو بہت تیز ہوتی ہے اور دوسرا جو ارد گرد کا علاقہ اور موسمی نالے ہوتے ہیں وہ طغیانی میں بپھر جاتے ہیں اترائی ہونے کی وجہ سے ان میں جو شدت پیدا ہو جاتی ہے وہ کسی بھی شے کو خاطر میں نہیں لاتی۔ پانی کی طاقت کا اندازہ پہاڑی علاقہ میں ہی ہوتا ہے۔ جب یہ پوری طاقت میں کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتا اور ہر شے کو توڑ مروڑ کر بہا کر لے جاتا ہے۔

ایسا ہی ایک موسمی نالہ جو میاں جی خیل گرگری روڈ کے ساتھ متوازی ہے ایک جگہ پر روڈ کو کاٹتا ہے جہاں روڈ میں ایک گہرا موڑ سا بن جاتا ہے۔ پانی کی شدت جب بڑھی تو یہ نالہ بدمست ہو گیا اور سڑک کو دائیں طرف کاٹ کر مقامی بند کی طرف زور و شور سے جانا شروع ہو گیا۔ اس موڑ کے درمیان میں گاڑی

روک لی گئی جو شاید اس انتظار میں تھی کہ پانی کا زور ذرا کم ہو تو گاڑی پار کی جائے لیکن پانی کی شدت اور غم و غصہ میں کمی کی بجائے اضافہ ہی ہوتا رہا اور یہاں تک اس سڑک جہاں نالہ کراس کر رہا تھا، پانچ چھ فٹ اونچائی تک کی پانی کی لہریں گزر رہی تھیں۔ اب ڈرائیور سے یہ غلطی ہوئی کہ اس نے وہاں گاڑی روک لی اور اس انتظار میں کہ پانی کم ہو تو گاڑی کراس کروں۔ وہاں وقت زیادہ لگا دیا اور پھر پانی کا ایک زوردار ریلا ایسا آیا کہ گاڑی الٹ گئی اور تمام لڑکے پانی میں چھلانگیں لگانے پر مجبور ہو گئے۔

لڑکوں کی اکثریت تو سرکاری سامان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے باحفاظت کم پانی والے حصے کی طرف چلی گئی لیکن طارق عزیز اور پراسپکٹر، جس کا نام ذہن سے نکل گیا ہے، اپنے اپنے برقی آلات کو بچانے کی فکر میں گاڑی کی چھت کے ساتھ لپٹے رہے۔ دوسرے لڑکوں نے بہت آوازیں لگائیں کہ چھلانگ لگا کر ہمارے ساتھ آ جاؤ لیکن وہ اشارتاً برقی آلات کی طرف آگاہ کرتے رہے کہ اس کا کیا کریں یہ آلہ ضائع ہو جائے گا۔ اسی دوران ایک جان لیوا ریلا آیا اور آناً فاناً طارق عزیز اور پراسپکٹر کو بہا کر گہرے پانی میں لے گیا۔ دونوں کو تیراکی بھی نہیں آتی تھی، اگر آتی بھی ہوتی تو اس طاقت ور پانی کے ریلے میں کیا کام آتی۔ بس ایک دو دفعہ ان کے سر پانی سے اوپر دکھائی دیے جیسا کہ وہ کوشش کر رہے ہوں گے لیکن بعد میں اس بند کی طرف چلے گئے جو مقامی لوگوں نے پانی ذخیرہ کرنے کی نیت سے بنائے ہوتے ہیں۔ اسی دوران جن لوگوں نے چھلانگیں لگا کر اپنے آپ

کو محفوظ کر لیا تھا بہت شور کیا اور لوگوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی لیکن اس طوفانی بارش اور برستے پانی کے ریلوں نے ایک بھی نہ چلنے دی۔ آخر جب تمام کوششیں رائیگاں ہو گئیں تو کچھ لڑکے کسی طرح کیمپ پہنچے اور کیمپ انچارج جناب امیر زریں عارف کو ساری تفصیل سے آگاہ کیا۔ یہاں امیر زریں عارف صاحب کا تعارف کروانا بے حد ضروری ہے کیونکہ جس ذمہ داری، محنت، جانفشانی، خلوص اور ایک بہترین لیڈر کے خواص سے بھرپور طریقے سے انھوں نے اس ناگہانی ایمرجنسی کا مقابلہ کیا شاید ہی کوئی اور کر سکتا۔ میرے ذاتی خیال میں انھوں نے کھانا پینا تو ایک طرف ایک پل نیند لینے سے بھی اجتناب کیا۔

جیسے ہی امیر زریں عارف صاحب نے معاملے کی نزاکت کا احساس کیا تو فوراً جائے وقوعہ پر پہنچے اور تقریباً ساری رات ہی گمشدہ لڑکوں کو تلاش کرتے رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور بارش بھی رک گئی۔ ہر طرف خاموشی اور سکون ہو گیا۔ طوفان ابر گیا، اپنے ساتھ نہ صرف دو قیمتی جانیں لے گیا بلکہ علاقہ کی تباہی بھی کر گیا۔ اب جب آفس اور لاہور میں اس حادثہ کی اطلاع ملی تو فوراً ریسکیو مشن ترتیب دیا گیا اور ایک کمیٹی بن گئی جس میں میرے علاوہ جناب مقصود علی (مرحوم) چیف انجینئر کوہاٹ کیمپ کے ایڈمن آفیسر اور کیمپ انچارج شامل تھے۔ بارش کی وجہ سے مقامی بند ایک جھیل میں بدل چکا تھا اور تقریباً ایک سے ڈیڑھ مربع کلومیٹر ایریا میں محیط تھا۔

ہم سارا دن اس جھیل کے گرد چکر لگاتے کہ کہیں سے بھی پانی میں ڈوبنے

والے شہدا کی نعشیں نظر آ جائیں یا ان کا کوئی سراغ مل جائے لیکن سارا دن اور رات اسی تلاشِ بسیار میں ناکام گزر گیا۔ اگلے دن آرمی کے غوطہ خور نوجوان بھی آ گئے اور انھوں نے بھی اپنی سر توڑ کوششیں کر لیں لیکن نتیجہ صفر ہی رہا۔ یہاں پر انسانی المیہ ایک اور داستان رقم کر رہا تھا۔ طارق عزیز (مرحوم) کی منگیتر کو جب اس حادثہ کا علم ہوا تو وہ تقریباً اپنے حواس کھو بیٹھی اور جب تک ٹیلی فون پر جناب امیر زریں عارف صاحب کے ساتھ محوِ گفتگو رہی، بے چاری روتی رہی۔ یہی بات کرتی کہ طارق کو کچھ نہیں ہو گا سر، اپنی تلاش جاری رکھیں۔ وہ ادھر ہی کہیں ہو گا۔ تھوڑا زخمی تو ہو گا لیکن خدانخواستہ شہید بالکل نہیں ہو گا۔ آپ خوب کوششیں جاری رکھیں۔ اب یہاں امیر زیں عارف صاحب کو سلیوٹ ہوتا ہے کہ جسمانی مشقت وہ جو شہدا کی نعشوں کو ڈھونڈنے کے لیے کر رہے تھے، روٹی پانی اور آرام سے بالکل لاتعلق ہو کر اور تقریباً دو دن کی جسمانی و دماغی چور چور کر دینے والی محنت و مشقت کے ساتھ ساتھ یہ طارق کی منگیتر کی جذباتی گفتگو اور اس کو مسلسل تسلی دیتے رہنا کہ ہاں ہم مکمل محنت کر رہے ہیں ان شاء اللہ طارق مل جائے گا۔ حالانکہ یہ ہم سب کو علم تھا کہ طارق عزیز اور دوسرا شہید اب اس دنیا میں نہیں ہیں، اس کے باوجود ان کے لواحقین کو تسلی و تشفی دینا کوئی مذاق نہیں تھا۔ پرو سپیکٹر عیسیٰ خیل شہر کا تھا اور انتہائی چست و چالاک، باادب اور محنتی۔ اس کے باپ، بھائی اور دوسرے رشتہ دار بھی ہمارے ساتھ سارا سارا دن جھیل کے کنارے کنارے گھومتے رہتے اور کھانے پینے سے بے پروا اپنے پیارے کو زندہ یا

مردہ حالت میں تلاش کرتے رہتے۔

امیر زریں صاحب نے جتنی کوشش اور محنت کی، اس کا اثر ان کی ظاہری حالت سے عیاں تھا۔ ساتھ ہی طارق عزیز مرحوم کی منگیتر کی باتیں اور اس کو تسلی و تشفی دیتے رہنا۔ ان سے جتنا ہو سکا انھوں نے محنت کی لیکن قدرت کے کاموں میں دخل اندازی نہیں ہو سکتی۔ اس حادثے کے تیسرے دن جھیل نے دونوں شہدا کی نعشیں اگل دیں اور ان کو جھیل سے نکال کر چارپائیوں پر ڈال دیا گیا۔ بعد ازاں ان کو کیمپ آفس میں لے جا کر غسل دے کر وہیں سے تابوت بنوا کر عیسیٰ خیل روانہ کر دیا گیا۔

عیسیٰ خیل میں دونوں کی نماز جنازہ ایک کثیر تعداد کے ہجوم نے ادا کی۔ پروسپیکٹر کو تو وہیں عیسیٰ خیل میں ان کے آبائی قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا جبکہ طارق عزیز مرحوم کو میاں چنوں لے جایا گیا۔

طارق عزیز مرحوم بہت ذہین تھے۔ انھوں نے محکمہ کے امتحانات اور انٹرویو اچھے نمبروں سے پاس کر رکھے تھے اور امیر زریں صاحب سے تو فون کروا کر ہیڈ آفس سے اپنی کامیاب تقرری کی معلومات بھی لے رکھی تھیں۔ محکمہ نے ان کو 17 گریڈ کی پوسٹ کے لیے چن بھی لیا تھا، بس باضابطہ لیٹر آنے کا انتظار ہو رہا تھا کہ یہ ساری کارروائی ہو گئی۔ اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ بہر حال یہ واقعہ جب بھی یاد آتا ہے زبان گنگ اور دل و دماغ خاموش ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومین کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

## ابدی جُدائی

یہ واقعہ تحریر کرنا میرے لیے انتہائی مشکل رہا ہے۔ اس واقعے کو لکھنے سے پہلے میں اپنے پڑھنے والوں کو سورۂ یوسف جو قرآن کے بارہویں اور تیرہویں سپارے میں ہے اس کی طرف لے کر جانا چاہتا ہوں۔ بلا شبہ میں عربی دان نہیں اور نہ کسی عربی معلم کی طرح قرآن کو سمجھتا ہوں لیکن جتنا بھی پڑھتا ہوں ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں۔ سورۂ یوسف کو کئی مترجمین اور مفسرین نے بہت سے زاویوں کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس کے اسرار ورموز عوام الناس کو سمجھانے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ میں اس سورۃ کو جب بھی پڑھتا ہوں تو ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ ملا کر تو اتنا اپنے آپ کو کمزور اور رقیق القلب محسوس کرتا ہوں کہ بے اختیار رونا آجاتا ہے بلکہ ہچکیوں کے ساتھ روتا ہوں۔ اب آپ پوچھیں گے کہ کیا وجہ ہے تو میری عرض یہ ہے کہ اس سورۃ میں باپ اور بیٹے کی محبت جس طرح بیان ہوتی ہے اور جس نے بیان کی ہے وہی ذات بابرکت ہے جس نے باپ بیٹا بنایا اور ان میں محبت ڈالی۔ باپ بیٹے کی محبت کا وہ حصہ خاص طور پر جب حضرت یوسف علیہ السلام اپنا کرتا بھائیوں کے ذریعے اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کو بھیجتے ہیں کہ وہ اس کو اپنے چہرے پر ڈال لیں تو ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی اور وہ دیکھنے کے قابل ہو جائیں گے۔ ابھی کرتا حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس نہیں پہنچتا تو اس کی خوشبو والد کو آنے لگتی ہے اور وہ بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں کہ مجھے یوسف کی خوشبو آرہی ہے۔ غرضیکہ

اس سورۃ میں کئی مقامات پر والد اور بیٹے کی محبت جُدائی کے لمحات اور صبر مجھ جیسے انسان کی برداشت سے باہر ہیں اس لیے مجھے ہمیشہ سے اس سورۃ کو پڑھتے ہوئے عجیب سی جذباتی کیفیت سے گزرنا پڑتا ہے۔

ایسا ہی ایک معاملہ جس کا ذکر کرنے کے لیے میں نے یہ تمہید باندھی ہے، باپ اور بیٹے کی لازوال محبت، جدائی کا غم بلکہ ابدی جُدائی کا غم اور پہاڑ سے بھی بلند تر صبر کا ذکر ہے۔ ہوا یوں کہ ایک صبح جب آفس پہنچا تو علم ہوا کہ ڈی جی صاحب دفتر میں نہیں ہیں اور ہیڈ کوارٹر سے اطلاع آتی ہے کہ کندیاں پراجیکٹ کا ایک SE نزدیکی نہر میں ڈوب کر غریقِ رحمت ہو گیا ہے۔ اس کا جسدِ خاکی لاہور سپردِ خاک کرنے کے لیے لال پل نزد مغل پورہ میں ایک جگہ پہنچ رہا ہے اس لیے کوئی سینئر آفیسر جنازے میں شرکت کرے اور ادارہ کے سربراہ کی طرف سے اس کا نمائندہ بن کر قبر پر پھولوں کی چادر چڑھائے۔ چونکہ اس وقت دفتر میں میرے علاہ کوئی دوسرا سینئر آفیسر موجود نہیں تھا اور یوں بھی مجھے ایسے کئی معاملات سے گزرنا پڑتا تھا، اس لیے اس واقعے کو بھی سرسری سمجھا اور وقتِ مقررہ پر چوہدری حنیف سینئر ایڈمن آفیسر اور بابر نذیر کے ساتھ مرحوم کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر کچھ حقائق سنے کہ اس کے والد صاحب تبلیغی جماعت کے سرگرم رکن ہیں اور آج کل اندرونِ سندھ میں تبلیغ کے سلسلہ میں گئے ہیں۔ ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ بہر حال ہم ایک کمرے میں بچھی ہوئی دری پر بیٹھ گئے اور مرحوم

کے بارے میں معلومات لینا شروع کر دیں۔ معلومات کے مطابق مرحوم اپنے والد کے سب سے ہونہار بیٹے تھے اور نامساعد حالات کے باوجود پڑھائی میں اچھے نمبروں کے ساتھ کامیابی حاصل کرتے تھے اور باقی بھائی کوئی خاص پڑھے لکھے نہیں تھے اور بس واجبی سا کام کر کے روٹی روزی کماتے تھے۔ باتوں باتوں میں مرحوم کی کئی خوبیاں بھی علم میں آئیں اور ساتھ ہی ان کے والد صاحب کی محنت اور عبادت کے قصے سننے کو ملے۔ اب مرحوم کی اس جواں ناگہانی موت کے بارے میں جو معلومات ملیں ان کے مطابق مرحوم کو تیراکی کا بہت شوق تھا۔ جو یہاں لاہور کی نہر میں اس لیے پورا نہ ہو سکا کہ پڑھائی میں کامیابی حاصل کرنے کی وجہ سے اتنا وقت ہی نہ نکال سکے کہ یہاں پر اپنا شوقِ تیراکی پوری کرتے لیکن جب محکمہ میں جاب مل گئی اور اپنے آپ کو secure اور settle سمجھنا شروع کر دیا تو تیراکی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔ اس مقصد کو پانے کے لیے تیراکی سے متعلقہ معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں۔ بقول ان کے ایک کولیگ کے اس کے ہمراہ وہ کندیاں نہر میں تیراکی کرنے کے لیے چلے بھی گئے اور اپنے کولیگ کو بتاتے رہے کہ میں نے تیراکی یوٹیوب کی مدد سے مکمل سیکھ لی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ میں اس بڑی نہر میں تیراکی نہ کر سکوں۔ ان کے دوست نے انھیں بہت سمجھایا کہ یوٹیوب سے تیراکی سیکھنا الجبرا یا سائنس کے کسی مضمون کو سیکھنے کی طرح نہیں ہوتا، اس کے لیے باقاعدہ مشق کرنی پڑتی ہے اور کم گہرے پانی سے ابتدا کرنا پڑتی ہے۔ اس دن تو مرحوم مان

گئے اور واپس چلے گئے لیکن ہوسٹل میں جا کر ایک بار پھر سے کمپیوٹر میں یوٹیوب پر تیراکی کے طریقے غور سے دیکھنے لگے۔ اگلی صبح اپنے دوست کے ہمراہ دوبارہ کندیاں نہر میں گئے اور ضد کر کے اس میں کود گئے۔ اب یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن نہر کے بہاؤ کی سمت میں ایک چھوٹی سی پُلی آتی تھی جس میں پانی ذرا گہرا ہوتا ہے اور تیزی میں ہوتا ہے۔ مرحوم چونکہ مکمل تیراک نہیں تھے اس لیے غوطے کھانا شروع ہو گئے اور تھوڑی ہی دیر بعد گہرے اور تیز پانی کی زد میں آ کر پُلی کے نیچے اینٹوں والے پختہ بند کے ساتھ بہت شدت سے ٹکرائے۔ سر پر بہت گہری چوٹیں آئیں اور پھر پانی میں ڈوب گئے۔ دوست بیچارا پریشانی کا مارا کبھی ادھر تو کبھی ادھر، لوگوں کو مدد کے لیے پکارے لیکن مرحوم سطحِ آب پر نہ آئے اور کافی دیر بعد جب بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے تو انھوں نے مرحوم کی نعش کو نہر کی پُلّی سے اچھے خاصے فاصلے پر جا کر نکالا۔ مرحوم کا سر پھٹ چکا تھا اور خون متواتر نکل رہا تھا اسی حالت میں نہلایا اور کفنایا گیا اور جسدِ خاکی کو لاہور میں دفنانے کے لیے بھیج دیا گیا۔

یہ ساری باتیں سننے کے بعد مجھے اس کے والد پر بہت ترس آیا کہ جس نے اتنی محنت اپنے اس بیٹے پر کی اور اب جب فصل پک گئی اور نفع کمانے کا وقت آیا تو بیٹا اس جہانِ فانی سے رُخصت ہو گیا۔ انھی باتوں کے درمیان کسی نے آ کر اطلاع دی کہ مرحوم کے والد کو اطلاع ہو گئی ہے اور وہ کراچی سے پہلی دستیاب فلائیٹ پر لاہور آ رہے ہیں۔ چنانچہ میں اور میرے وفد نے وہاں سے اُٹھ کر واپسی کا قصد

کیا۔ مرحوم کی تگ و دو اور مرحوم کے والدِ محترم کی بابت جو بھی معلومات ملیں اور چشمِ زدن میں مرحوم کے والد کا اس خبر کو سن کر ممکنہ ردِ عمل اور یوں جوان فصلِ گُل کا ویران ہونا میرے اعصاب پر کافی بُرا اثر ڈال گیا۔ مجھے ایک دم اپنی کمزوری اور کم مائیگی کا شدت سے احساس ہونے لگ گیا۔ بار باراس والد کا چہرہ جو تبلیغی بھائیوں کے حلیہ سے ملتا جلتا، شفاف چہرہ بلکہ مطمئن اور تر و تازہ میری خیالی نظروں میں آئے اور وہ کیسے اس صدمہ کو جھیلنے کے لیے تیار ہو گا۔ کیسے لوگوں کے ہجوم سے گلے ملے گا اور کیا اپنے جذبات پر کتنا کنٹرول کر سکے گا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب ذہنی سوچ اور غم کے مختلف زاویے مجھے بری طرح سے کمزور کر گئے۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اگر مرحوم کے والد آ گئے اور تمام لوگوں سے رسماً ملنا شروع ہو گئے تو میں قطعاً ان سے نہیں ملوں گا بلکہ کوشش کروں گا کہ ان کا اور میرا آمنا سامنا نہ ہو۔ اس بات کا مصمم ارادہ کر لیا تو کسی حد تک اطمینان ہو گیا اور جسم میں جو لرزہ پن اور جذباتیت آ گئی تھی کسی حد تک قابو میں آ گئی۔ وہاں سے روانگی کے وقت مرحوم کے بھائیوں سے اچھی خاصی بے تکلفی بھی ہو گئی تھی۔ اس لیے دفتر واپسی سے قبل ان سے عرض کیا کہ جب مرحوم کے والد صاحب آ جائیں تو ہمیں ضرور اطلاع کر دیں تا کہ ہم بھی وقت مقررہ تک پہنچ جائیں اور اپنی سرکاری ڈیوٹی کے ساتھ ساتھ اخلاقی فرض بھی پورا کر لیں۔ اب معاملہ سرسری سا نہیں تھا بلکہ باپ کا امتحان جو یقیناً میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا لیکن جہاں اس نوکری نے اور جہاں عجیب و غریب مناظر دکھائے وہاں پر باپ بیٹے کی جدائی

کے منظر دیکھنا بھی نصیب میں تھا۔ چنانچہ جونہی اطلاع ملی کہ مرحوم کے والدِ محترم لاہور ائیر پورٹ پر جہاز سے اتر چکے ہیں اور جنازہ گاہ کی طرف روانہ ہیں تو اسی وقت ہم بھی آفس سے نکلے اور مرحوم کے جنازہ کے پاس جانے کے لیے روانہ ہوئے۔

اب میں نے چونکہ مصمم ارادہ کیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے میں اپنی شناخت چھپائے رکھوں گا اور مرحوم کے والد کا سامنا نہیں کروں گا تاکہ جو کیفیت اس باپ پر گزر رہی ہوگی میں اس کو نہ دیکھ سکوں اس لیے جنازہ گاہ کے ایک کنارے پر میں گاڑی سے اتر گیا اور اپنے ساتھیوں کو کہا کہ وہ مرحوم کے والد کو مل کر تعزیت کریں اور محکمہ کی طرف سے جو بھی قانونی مداوا ہوتا ہے ان کو بتادیں۔ جنازہ گاہ جو باقاعدہ باؤنڈری والا نہیں بلکہ ایک کھلا میدان تھا بلکہ قبرستان تھا۔ قبرستان بھی نیا نیا بنا تھا کیونکہ قبریں چند ایک ہی تھیں اور مرحوم کے لیے بھی قبر کھودی جا چکی تھی۔ ابھی ہم میدان کے ایک طرف تھے اور مرحوم کے والد میدان کے دوسری طرف۔ جیسا کہ میں نے خیالات میں مرحوم کے والد کو دیکھا تھا، سفید شلوار قمیض اور سفید ہی سر پر رکھنے والا کپڑا ویسا ہی پایا۔ وہاں وہ مقامی لوگوں سے مل رہے تھے اور یقیناً انھوں نے ہماری طرف نہیں دیکھا تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ہم ان کے عقب میں تھے تو بے جا نہ ہوگا۔ اسی اثنا میں کچھ لوگ وہاں وضو بنانے میں مشغول ہو گئے اور میں نے بھی بظاہر اس طرح کا انداز اپنا لیا جیسے میں بالکل اجنبی ہوں اور عام لوگوں کی طرح جنازہ میں شرکت کر رہا ہوں۔ اب

یہ تقریباً دو سو گز کے فاصلہ پر دوسرے لوگوں کے ساتھ کھڑے تھے، جب میری طرف آنا شروع ہو گئے۔ اب میں نے اپنی طبیعت کو محسوس کیا کہ وہ پھر ایک انجانے خوف یا شدید بے چینی میں مبتلا ہو گئی ہے۔ مرحوم کے والد سیدھے چل رہے تھے اور ہماری طرف آ رہے تھے۔ ایک پل تو احساس ہوا کہ میرا وہم ہے شاید وہ ان لوگوں کو ملیں جن میں مَیں کھڑا ہوں، اس لیے مجھے نارمل دکھائی دینا چاہیے۔ اب جوں جوں مرحوم کے والد اور میرے درمیان فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا، بے چینی اس لیے بھی بڑھ رہی تھی کہ ان کی آنکھیں بالکل سیدھی میری طرف تھیں اور دائیں بائیں نہیں دیکھ رہے تھے۔ مرحوم کے والدِ محترم کی رفتار تیز ہونا شروع ہو گئی اور فاصلہ مزید کم ہونا شروع ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی جگہ چھوڑوں تاکہ مرحوم کے والد کسی اور کو مل لیں، وہ سیدھے میری طرف ہی آئے اور اپنے دونوں بازو پھیلا دیے۔ چشم زدن میں میری بانہیں بھی پھیل گئیں اور ہم نے معانقہ کیا۔ مجھے قطعاً سمجھ نہ آئی کہ کیا ہوا ہے؟ مرحوم کے والد نے مجھے کیسے پہچانا، کیونکہ میرے کپڑے یعنی شلوار قمیض بھی دوسرے لوگوں کی طرح تھی اور نہ کسی نے میری نشان دہی کی تھی کیونکہ میں تو ان کو اس وقت سے دیکھ رہا تھا جب وہ لوگوں سے روایتی افسوس اور غمی والے معاملات میں مصروف تھے۔ یہ کیسے ہوا کہ مرحوم کے والد سیدھا میرے پاس آئے معانقہ کیا اور اناللہ و انا الیہ راجعون پڑھ کر بولے۔ اللہ ہی کا مال تھا وہ واپس لے گیا۔ ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ان کی آواز میں بے پناہ ٹھہراؤ، اعتماد، یقین اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی مرضی کو سینے سے

لگانے کے تاثرات نمایاں تھے۔ مجھے ایسے لگا جیسے وہ مجھ سے اظہارِ افسوس کر رہے ہوں اور تسلی و تشفی دے رہے ہوں۔ الامان الحفیظ میں جس بات سے ڈر رہا تھا وہی ہوا لیکن قربان جائیں اللہ تبارک و تعالیٰ کے وہ اپنے نیک، پاکیزہ اور چنے ہوئے لوگوں میں وہ اوصاف پیدا کر دیتا ہے جو دوسرے عام بندے سمجھ ہی نہیں سکتے۔ بہر حال کچھ دیر بعد نمازِ جنازہ ادا کر دی گئی جس میں سینکڑوں لوگ شریک تھے اور بعد میں مرحوم کا جسدِ خاکی قبر میں رکھ دیا گیا۔ قبر تیار ہو گئی اور ڈھیروں من مٹی ایک گنبد نما ڈھیری کی شکل میں اکٹھی کی گئی۔ پہلے پہل گھر والوں نے قبر پر پھولوں کی چادریں چڑھائیں اور اس کے بعد میں نے اپنے محکمہ کی طرف سے قبر کے سرہانے پھولوں کا گول گلدستہ رکھا۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد فارغ ہوئے تو مرحوم کے والد نے ایک بار پھر معانقہ کیا اور بہت زیادہ شکریہ ادا کیا کہ آپ لوگ آئے اور میرے دکھ میں شریک ہوئے۔ واپسی پر میرے منہ سے کوئی بات نہ نکلی اور آنکھوں سے آنسو بھی خشک نہ ہوئے۔ یہ واقعہ ابھی تک ایسے ہی میرے ذہن میں تازہ ہے جیسے میں نے تحریر کیا ہے۔ اللہ اللہ بے شک، بس ہمیشہ رہنے والی وہ خدا کی ذات ہے۔

باب نہم

# پُر اثر شخصیات

## مولانا احسان الٰہی ظہیر (شہید)

یہ 1974 کے ان ایام کا ذکر ہے جب پوری قوم ختم نبوت کے سلسلہ میں اکٹھی ہوئی تھی اور پورے ملک میں ختم رسل جناب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ محبت اور عقیدت کا اظہار پوری شد و مد سے اور ایمانی اور روحانی کیفیت میں سرشار ہر جگہ ہو رہا تھا باقی شہروں کی کیفیات تو ہم لوگ اخبارات میں پڑھ رہے تھے لیکن لاہور ہمارے اپنے شہر میں جگہ جگہ اس سلسلے میں جلوس نکل رہے تھے جلسے منعقد کیے جا رہے تھے اور نامور علماء مساجد میں نبی مکرم ﷺ کی شان نبوت اور ان کے ختم رسل کے حوالے سے تقاریر کر رہے تھے۔

اس سلسلے میں ہمارے رحمان پورہ سے متصل ایک بستی کرم آباد کی مسجد میں جناب مولانا احسان الٰہی ظہیر (شہید) تشریف فرما تھے اور ختم نبوت کے موضوع پر اظہار خیال فرما رہے تھے۔ ساری مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور

عاشقان رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک ہجوم تھا جو مسجد کے اندر اور باہر ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی مانند موجود تھا اور ختم نبوت سے متعلقہ نعرے پُرجوش ہو کر وقفہ وقفہ سے لگارہے تھے اور لوگوں کی روحانی کیفیت کو بڑھارہے تھے۔

اسی دوران مولانا احسان الٰہی ظہیر کی گھن گرج آواز، کلام میں تیزی اور روانی، بیان کے اجزاء میں زیر و بم اور مکمل ایمانی کیفیت میں ڈوبی تقریر لوگوں کے ایمان کو جلابخش رہی تھی۔ میری چونکہ ایک طرح کی محلے کی مسجد تھی اور بچپن سے اسی مسجد میں نمازیں پڑھتا آیا تھا اس لیے باوجود زبردست بھیڑ اور رش کے میں مختلف کونے کھدروں سے ہوتا ہوا مسجد کے مرکزی دروازے سے امام صاحب کی جگہ پر پہنچ گیا جہاں مائک تھا اور مولانا احسان الٰہی ظہیر شعلہ نوا بنے ہوئے تھے۔ اور تو کہیں جگہ نہ ملی، میں ان کے قدموں میں پھنس کر بیٹھ گیا اور ان کی تقریر سننے لگا۔

اللہ اللہ کیا کمال عطا ہوا تھا مولانا کو، جب مولانا جوش خطابت میں آواز بلند کرتے تھے تو یہ یقین جانیے زمین کانپتی، اور میں واضح طور پر زمین کو ہلتے ہوئے محسوس کرتا۔ اب صورت احوال یہ ہو گئی کہ مزید لوگ مسجد میں آ گئے اور نتیجتاً مجھے اور سکڑنا پڑ گیا اور یوں ہوا کہ میں مولانا کی ٹانگوں کے ساتھ ہی جُڑ کر بیٹھ گیا اور میرا جسم اور مولانا (شہید) کی ٹانگیں متصل ہو گئیں۔ اب صورت احوال ایسی ہو گئی کہ جیسے ہی مولانا جوش خطابت میں آتے تو میں بھی تھرتھراہٹ محسوس کرتا اور میرا پورا جسم ایسے ہلتا جیسے زوردار دھماکہ ہوا ہو اور اس کی آواز کھڑکیوں

اور دروازوں کو اپنی لپیٹ میں لے کر گونج دار آواز کے زیر و بم میں مبتلا ہو۔
غرض یہ کہ مولانا کی تقریر تقریباً پونا گھنٹہ جاری رہی اور پتا چلتا تھا کہ کوئی مجاہد
غرقِ ایمان ہے اور سوئے ہوئے دیوانوں کو آواز دے رہا ہے اور اس آواز کا نتیجہ
لوگوں کے فلک شگاف نعروں اور اس میں چھپے ہوئے اقرار کے ساتھ مل بھی رہا
ہے۔ چونکہ مولانا کی تقریر اس جلسہ کی آخری تقریر تھی، لوگوں سے وفاداری
پر کار بند رہنے کا پکا وعدہ لے کر مولانا نے مائیک چھوڑ دیا اور مسجد سے باہر نکلنے کا
انتظار کرنے لگے۔ مجمع عقیدت کے مارے مولانا کے پیچھے پیچھے نعرے لگاتا اور ختم
نبوت پر تن من دھن قربان کرنے کا اقرار کرتا، ایک زبردست کیفیت میں مبتلا
ہوتا مسجد کے مرکزی دروازے کی طرف واپسی کے لیے جارہا تھا لیکن جم غفیر اتنا
تھا کہ دو منٹ کا فاصلہ 30 منٹ میں طے ہوا اور مولانا کو حفاظتی حصار میں لیے
توحید کے پروانوں نے ان کی گاڑی تک پہنچایا۔

مولانا کا نام تو بارہا سنا تھا لیکن مولانا سے اس طرح کی ملاقات میرے لیے
اللہ کی طرف سے ایک بیش بہا تحفہ تھا۔ بعد میں بھی مولانا کو سننے کا موقع ملا اور
ان کے روح پرور بیانات پڑھنے کا سلسلہ جاری رہا لیکن جو کیفیت اور ولولہ مولانا کو
بنفس نفیس دیکھنے، سننے اور ان کے قدموں میں بیٹھ کر ان کی تقریر سننے کا ملا، وہ
دوبارہ نہیں ملا۔

مولانا ایک زبردست شخصیت کے مالک تھے۔ زبردست مقرر، علم قرآن
والحدیث سے مالا مال اور جوش و ایمان میں شہادت کے متمنی 1987 میں ایک بم

دھماکہ میں شدید زخمی ہو گئے اور انھیں اسی حالت میں سعودی عرب لے جایا گیا۔ آپ وہاں شہادت کے منصب پر فائز ہو گئے اور جنت البقیع میں دفن ہونے کا اعزاز پایا۔

## مولانا ابو الاعلیٰ مودودی (مرحوم)

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی (رحمت اللہ علیہ) ان نابغۂ روزگار شخصیات میں شامل ہیں جن کو انتہائی قریب سے دیکھنے بلکہ بغور جائزہ لینے کا موقع ملا۔ جامعہ اشرفیہ فیروز پور روڈ میں مجھے یاد ہے کہ والدِ محترم اکثر جمعۃ المبارک کی نماز ادا کرنے اور کبھی کبھار عیدین کی نماز کی ادائیگی کے لیے جامعہ اشرفیہ تشریف لے جاتے اور اپنے ہمراہ ہم بھائیوں کو بھی لے جاتے۔ جامعہ اشرفیہ میں مولانا عبد الرحمٰن اور مولانا عبید اللہ کا بہت چرچا تھا۔ مولانا عبید اللہ بڑے بھائی تھے اور مولانا عبد الرحمٰن اشرفی ان سے چھوٹے تھے۔ جمعۃ المبارک اور عیدین کے موقع پر مولانا عبد الرحمٰن انتہائی روح پرور اور ایمان کو تازہ کرنے والے خطبات ادا کرتے۔ ان خطبات میں دینِ اسلام کی جزیات انتہائی باریک بینی اور منطقی انداز میں بیان کرتے۔ نہایت ادب و احترام سے نبی پاک ﷺ کی بعثت بطور نبی اور رسول اور سیرتِ مبارکہ کا احاطہ کرتے اور بعض اوقات عقیدت و محبت سے مغلوب ہو کر جذباتی کیفیت سے بھرپور ہو کر ساری محفل اور سامعین کو آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ سر دُھننے پر مجبور کر دیتے۔ مولانا عبد الرحمٰن کئی دہائیوں تک اپنے اس فرض کو نبھاتے رہے اور جامعہ اشرفیہ میں نمازیوں کی تعداد

دن بدن بڑھتی رہی۔ مولانا عبید اللہ فرض نماز اور جمعۃ المبارک کے عربی خطبہ کے ساتھ عیدین کے خطبات بھی پڑھتے اور اپنی خوش الحان عربی اور اس کے منفرد انداز سے حاضرینِ محفل کے دلوں میں روحانیت پھونکتے تھے۔ مجھے جامعہ اشرفیہ میں لگاتار آٹھ سال تک مسلسل تراویح پڑھنے کا اعزاز اللہ تعالیٰ نے عطا کیا اور خاص طور پر ستائیس رمضان المبارک میں مولانا عبد الرحمٰن کی رات ایک بجے والی دعا میں شرکت کرنے کا موقع۔ خاص طور پر ایک بات سمجھ لیں، روحانی ورثہ ہے جس پر جتنا رشک کروں کم ہے۔

اسی جامعہ اشرفیہ میں 1985 تک جب تلک میں لاہور میں رہا تقریباً اکثر جمعۃ المبارک پڑھنے کی سعادت مجھے حاصل رہی۔ یہ غالباً 70 کی دہائی کے وسط کی بات ہے جب میں نے جامعہ اشرفیہ میں تراویح، جمعہ اور نماز عیدین باقاعدگی سے ادا کرنا شروع کیں۔ ان دنوں جامعہ اشرفیہ کی مرکزی عمارت میں لوگ تراویح کے لیے موجود ہوتے اور اتنا رش نہ ہوتا جبکہ جمعۃ المبارک میں بھی مرکزی عمارت کے علاوہ برآمدے میں نمازی سمو جاتے لیکن عیدین کے مواقع پر جامعہ اشرفیہ کا صحن کھچا کھچ نمازیوں سے بھر جاتا۔

غالباً 1974 کے بعد سے لے کر 1982 تک جمعۃ المبارک میں نمازیوں کا رَش صرف مرکزی عمارت اور صحن تک محدود تھا۔ میں بچپن سے نکل کر لڑکپن کی عمر میں پہنچ چکا تھا اور جامعہ اشرفیہ، اس کے ماحول، دونوں علما برادران یعنی مولانا عبید اللہ اور مولانا عبد الرحمٰن، ان کے خطبات، وعظ، تلاوت اور وضع قطع

اتنی بھائی ہوئی تھی کہ ان جیسی عادات اپنے اندر بھی محسوس کرتا تھا۔ پھر اسی جامعہ اشرفیہ میں لمبے قد کے ایک مؤذن تھے جو ہر جمعہ خوش الحانی سے سورۃ رحمٰن کی تلاوت کرتے اور جب اذان دیتے تو وہ بھی انتہائی منفرد انداز اور آواز کے ساتھ۔ تمہید کچھ زیادہ بڑھ گئی ہے۔ میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں کہ جامعہ اشرفیہ میں جمعۃ المبارک کی نماز ڈیڑھ بجے دوپہر ادا کی جاتی تھی اور ہم لوگ یعنی میں اور ایک آدھ بھائی بمعہ چند دوستوں کے جامعہ اشرفیہ کی مرکزی عمارت میں جہاں مولانا عبدالرحمٰن صاحب خطبہ ادا کر رہے ہوتے تھے تقریباً 1 بجے پہنچ جاتے تھے اور تیسری یا چوتھی صف میں بیٹھ جاتے تھے۔ رش اتنا نہیں ہوتا تھا۔ مولانا عبدالرحمٰن کوئی مسئلہ بڑی شد و مد سے سمجھا رہے ہوتے اور ہم کچھ ان کی باتیں سنتے اور کچھ دائیں بائیں لوگوں کو دیکھتے، خاص طور پر اپنے دائیں طرف ایک مشہور اسلامی فلاسفر بانیٔ جماعتِ اسلامی جناب سید ابو الاعلیٰ مودودی تیسری یا چوتھی صف میں بیٹھے نظر آتے۔ مولانا مودودی کو دیکھنے کے لیے اگر یہ کہوں کہ جامعہ اشرفیہ میں متواتر جمعہ کی نماز جو شاید پانچ یا چھ سالوں تک مسلسل رہی کی وجہ بنی تو بے جا نہ ہو گا۔ اس زمانہ میں مولانا مودودی کی مذہبی قدر جو تفہیم القرآن کی وجہ سے تھی وہ تو مسلمہ اور انتہائی اونچے مقام پر تھی لیکن سیاسی طور پر طوطی ذوالفقار علی بھٹو کا بولتا تھا۔ اب یہ بہت بڑی بحث بن جاتی ہے کہ جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کا قد دوسری سیاسی جماعتوں کے مقابلے میں چھوٹا کیوں رہ گیا۔ لہٰذا موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔ شروع شروع میں تو میں مولانا کو دور

دور سے ہی دیکھتا رہتا۔ پھر آہستہ آہستہ مولانا کے ساتھ ہی بیٹھنا شروع کر دیا۔ پھر اور نزدیک بیٹھ کر مولانا کا بغور جائزہ لینا شروع کر دیا۔ مولانا تو مولانا عبد الرحمٰن اشرفی کے خطبہ کو بڑے انہماک سے سننے میں مصروف رہتے اور میں مولانا کو دیکھتا رہتا۔ اگر مولانا کی شخصیت کا احاطہ کروں تو بلاشبہ مولانا انتہائی حسین اور پُرکشش چہرے کے مالک تھے۔ ان کی جلد کا رنگ کچھ ایسا تھا کہ جیسے دودھ میں سرخ گلاب گھلا ہو اور ویسی ہی چمک دمک۔ ایسا گلابی رنگت والا چمکدار چہرہ میں نے اپنی زندگی میں کہیں نہیں دیکھا۔ لباس وہ جو عموماً جمعہ والے دن پہنتے تھے، دو گھوڑا بوسکی کے رنگ ڈھنگ سے ملتا جلتا تھا۔ پاجامہ بھی کسی ایسے رنگ اور دھاگے سے بنتی کیا گیا کپڑے کا ہوتا تھا۔ جو بظاہر تو کاٹن لگتا تھا لیکن چمک دمک میں انتہائی مختلف اور نایاب قسم کا۔ جو لباس مولانا کو میں اکثر پہنتے دیکھتا اور وہ بھی جمعہ والے دن وہ اسی قسم کا تھا جو میں نے اوپر بیان کیا ہے غرضیکہ بالکل منفرد ہوتا تھا۔ سردیوں کے آغاز میں مولانا کو واسکٹ پہنے بھی دیکھا۔

مولانا کی شخصیت اور لباس کا اتنا نزدیکی مشاہدہ اور بیان کردہ تمہید کے پیچھے وہ ساری اُلٹی سیدھی باتیں تھیں جو مولانا کے سیاسی مخالفین نے پھیلائی ہوئی تھیں اور جن کو سن کر ایک کچی عمر کا نوجوان بغیر کسی تصدیق کے ایمان لے آتا ہے اور مصداق راہ پیا جانے یا واہ پیا جانے (پنجابی کہاوت) کے بالکل برعکس یقین کر لیتا ہے۔ اب مولانا کی وضع قطع، شکل و صورت اور پیرہن اس پروپیگنڈا کی نفی کرتے تھے جو آپ کے خلاف پھیلایا گیا۔ میں نے جب مولانا کی یہ وضع قطع

اور ان کے پاس بیٹھ کر بیشتر جمعہ کے خطبات کو سنا اور انیس الرحمٰن صاحب (میاں طفیل محمد کے بھانجے اور میرے کولیگ ) سے تبادلۂ خیال کیا تو ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اور بے ساختہ ان کی زبان سے الفاظ ایسے نکلے جیسے وہ میرے نصیب کے واری جا رہے ہوں اور رشک کر رہے ہوں۔ مولانا مودودی صاحب کو اس کے علاوہ بعد میں بہت سنا اور پڑھا لیکن عقیدت کے لحاظ سے بات ففٹی ففٹی رہی۔ جب مولانا کا انتقال ہو گیا اور اعلان کیا گیا کہ نمازِ جنازہ قذافی سٹیڈیم میں ادا کی جائے گی تو میں نے اس نمازِ جنازہ میں شرکت کرنے کا بھرپور ارادہ کیا کیونکہ قذافی سٹیڈیم میری رہائش گاہ رحمان پورہ کوارٹرز سے پیدل کا راستہ تھا۔ غالباً بعد از نماز عصر کا وقت مقرر تھا۔ اسی بنا پر کئی لوگ تو وہیں نماز عصر ادا کر رہے تھے اور جنھوں نے اپنی اپنی مساجد میں نمازِ عصر ادا کی تھی۔ وہ بڑے بڑے قدموں سے قذافی سٹیڈیم کا رُخ کر رہے تھے۔ زیادہ تر لوگ پیدل ہی جا رہے تھے۔ ان پیدل جانے والوں میں سے ایک میں بھی تھا اور جلدی جلدی قدم اُٹھا رہا تھا کیونکہ خدشہ تھا کہ اتنا بڑا ہجوم بنتا جا رہا تھا تو وہاں شاید مناسب جگہ ملتی بھی ہے یا نہیں۔ جیسے ہی قذافی سٹیڈیم کے اندر داخل ہوئے تو ایک جمِ غفیر نظر آیا۔ چاروں طرف سر ہی سر تھے اور گراؤنڈ کے اندر اور چاروں طرف کی سیڑھیاں لوگوں سے بھری ہوئی تھیں۔ میں نے چند سال پہلے جناب ذوالفقار علی بھٹو کا جلسہ جو انھوں نے قذافی سٹیڈیم میں کیا تھا اور تاریخی تقریر کی تھی وہ سٹیڈیم میں جا کر خود سنی تھی۔ وہ بھی ایک جمِ غفیر تھا لیکن اس جنازہ میں تو اس

جلسہ سے کہیں زیادہ لوگ موجود تھے بلکہ 2:1 کے تناسب سے تھے کیونکہ بھٹو صاحب کے جلسہ میں آدھا سٹیڈیم خالی تھا۔ پھر بھی بہت زیادہ رش دکھائی دیتا تھا۔ جبکہ اس نمازِ جنازہ میں سارا گراؤنڈ بھرا ہوا تھا اور پیچھے والی سیڑھیوں پر بھی لوگ موجود تھے۔ میں نے اپنی ساری زندگی میں اس سے بڑا اجتماع نہیں دیکھا اور نہ ہی میں نے کسی اتنے بڑے اجتماع میں شرکت کی۔ نمازِ جنازہ بڑی عقیدت اور احترام سے ادا کی گئی۔ بعد ازاں جسدِ خاکی مولانا کی رہائش گاہ میں سپردِ خاک کیا گیا۔

## ڈاکٹر اسرار احمد (مرحوم)

ڈاکٹر صاحب بلا شبہ اپنے وقت کے چند چوٹی کے داعیان اور ماہرِ قرآن کے زمرے میں آتے ہیں۔ شروع شروع میں پاکستان ٹیلی ویژن میں ان کے پروگرام (بیان) کو باقاعدگی سے دیکھتا اور ڈاکٹر صاحب کو سنتا۔ بعض باتیں سمجھ میں آتیں اور بعض ذہنی ناپختگی کی بنا پر نہ آتیں۔ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں کچھ پہلے دوسروں کی زبانی اور پھر ڈاکٹر صاحب کی اپنی زبانی علم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب شروع میں مولانا مودودی کے ساتھیوں میں سے تھے اور جماعتِ اسلامی کے بیشتر معاملات میں شریک رہے۔ بعد میں کچھ اختلافات رونما ہوئے اور جماعت سے علیحدگی اختیار کر کے اپنی علیحدہ جماعت تنظیمِ اسلامی کے نام سے بنائی۔ ڈاکٹر صاحب ماڈل ٹاؤن K بلاک میں رہائش پذیر تھے اور رہائش سے ملحقہ مدرسہ اور مسجد میں قرآن حکیم کے درس و خطبات میں مصروف رہتے تھے۔ ان

دنوں میں یونیورسٹی کے آخری سالوں میں تھا اور کرکٹ کے جنون کی وجہ سے ماڈل ٹاؤن میں اکثر کرکٹ کے میچ کھیلنے جایا کرتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کرکٹ کا میچ جمعہ والے دن ہوتا تو جمعہ کے وقفے کے دوران میچ کو کچھ دیر کے لیے معطل کر کے ڈاکٹر صاحب کی مسجد میں جمعہ پڑھنے چلا جاتا۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب کا بیان ہو رہا ہوتا اور صحن یا سڑک پر بچھی صفوں میں بیٹھ کر ڈاکٹر صاحب کی گھن گرج والی تقریر سے فیض یاب ہوتا۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ مجھے مرکزی عمارت میں ڈاکٹر صاحب کے روبرو دو یا تین صفیں چھوڑ کر جگہ ملتی اور یوں ڈاکٹر صاحب کو بغور دیکھنے اور سننے کا نادر موقع ملتا۔

ڈاکٹر صاحب کی انجمن خدام القرآن کے شعبہ میں میرے ایک دوست بھی کام کرتے تھے۔ ان کی وجہ سے بھی ڈاکٹر صاحب کے بارے میں بہت قیمتی معلومات ملیں، سب سے بڑھ کر ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے بارے میں کہ ڈاکٹر صاحب کے قول و فعل میں کسی قسم کا کوئی تضاد نہیں تھا۔ اگر زنان خانے میں کسی غیر مرد کا جانا قطعاً ممنوع تھا تو ڈاکٹر صاحب کے گھر میں زنان خانہ میں کوئی غیر مرد نہیں جا سکتا تھا۔ اگر غیر ضروری مال و دولت جمع کرنا منع ہے تو ڈاکٹر صاحب نے اس بات پر سختی سے عمل کیا اور بعد از وفات جو معمولی متاع تھی وہ بھی اللہ کی راہ میں دے دی۔ اسی طرح ڈاکٹر صاحب اپنی زندگی میں جن جن باتوں اور احکامات کو قرآن اور سنت کی روشنی میں بیان کرتے تھے ان احکامات پر خود بھی کاربند رہے۔

2011 میں جب میری ڈیوٹی گلگت میں تھی تو ڈاکٹر صاحب کی رحلت کی خبر ملی۔ اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ یقیناً وہ اپنے وقت کے ولی اللہ تھے۔

## قاضی حسین احمد (مرحوم)

قاضی حسین احمد (مرحوم) غالباً تیسرے امیر جماعتِ اسلامی تھے۔ قاضی صاحب میرے انتہائی عزیز دوست اور ساتھی جناب مجیب الرحمٰن صاحب کے رشتہ میں ماموں لگتے تھے۔ مجیب الرحمٰن صاحب جب بھی اپنی فیملی کے ساتھ لاہور تشریف لاتے تو میری طرف رحمان پورہ کوارٹرز وحدت روڈ پر آتے اور اس دوران موقع محل کی مناسبت سے وقت نکال کر منصورہ ملتان روڈ میں قاضی صاحب کو ملنے کے لیے ضرور جاتے۔

قاضی صاحب تقریباً 20،21 سال تک امیر جماعتِ اسلامی کے عہدے پر براجمان رہے۔ شاید 1987 تا 2008 تک کا دور قاضی صاحب کا امیر کے عہدہ پر فائز رہنے کا تھا۔ یہ غالباً 1997 کے الیکشن کا زمانہ تھا جب مجیب الرحمٰن صاحب بمعہ اپنی فیملی کے لاہور تشریف لائے اور میرے پاس قیام پذیر رہے۔ اس دفعہ مجیب الرحمٰن صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ قاضی صاحب کی فیملی کو ملنے کے لیے منصورہ جانا ہے لہٰذا وقت نکالیں۔ چنانچہ اپنے والد صاحب کے زیرِ استعمال سوزوکی ڈبہ نکالا اور سارے بچے اس میں سوار کیے اور وحدت روڈ اور ملتان روڈ کے سنگم پر واقع منصورہ جو جماعتِ اسلامی کا ہیڈ کوارٹر ہے وہاں چلے گئے۔ منصورہ

میں دس مرلہ یا 12 مرلہ گھر ایک قطار میں ایسے بنائے گئے ہیں جس طرح وحدت کالونی کے سرکاری کوارٹرز۔ بہر حال ایک مکان کے سامنے گاڑی کھڑی کی اور جہاں ایک گارڈ بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے کہا کہ قاضی صاحب کو اطلاع کریں کہ مہمان آئے ہیں۔ چنانچہ وہ اکلوتا گارڈ اُٹھا، کال بیل دبائی اور کچھ دیر بعد دروازہ جو سیدھا سڑک کے ساتھ ہی تھا، نہ کوئی لان نہ راہداری بہت سادہ رہائش گاہ۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ ایک مشہور و معروف سیاسی جماعت کا امیر اور ایک اسلامک فلاسفر اس نہایت سادہ گھر میں مقیم ہے۔ بہر حال اندر گئے تو ساتھ ہی ڈرائنگ روم میں جو میرے خیال میں 12x12 فٹ سائز تھا اور ایک چھوٹی ڈائننگ ٹیبل جس کے ساتھ 6 کرسیاں تھیں۔ ساتھ ہی صوفہ پڑا تھا اپنی سادگی لیکن پُر وقار شان لیے ہوئے، اس پر بیٹھ گئے۔ عورتیں زنان خانہ میں چلی گئیں اور تھوڑی دیر کے بعد ایک بردبار، بارعب سُرخ و سفید رنگت اور سفید داڑھی والی شخصیت جس نے بہترین سفید رنگ کی شلوار اور قمیض پہنی ہوئی تھی، ہاتھ میں ایک ٹرے جس میں شربت کا بھرا ہوا جگ اور ساتھ گلاس تھے، نمودار ہوئی۔ یہ جناب قاضی حسین احمد امیر جماعتِ اسلامی تھے۔ قاضی صاحب کی شخصیت کا سحر تھا یا ایک مردِ مجاہد کی عطائے ربِ جلیل شان کہ میں دفعتاً ادب سے کھڑا ہو گیا اور نہایت مؤدب انداز سے قاضی صاحب کے ساتھ ہاتھ ملانے کا شرف حاصل کیا۔ ہاتھ بظاہر تو سخت محنت کش کی طرح تھے لیکن جب میرے ہاتھوں نے ان ہاتھوں کو چھوا تو ایسے لگا جیسے روئی کے گالے ہوں۔ قاضی صاحب نے ہاتھ ملانے کے بعد میرے

ہاتھ چھوڑے نہیں بلکہ انتظار کیا کہ میں ہی ان کے ہاتھ چھوڑوں۔ بہر حال درمیان میں مجیب الرحمٰن صاحب تھے، جنھوں نے اپنے ماموں سے معانقہ کیا اور سلام و دعا کے بعد بیٹھ گئے۔ میرا یہ حال تھا کہ میں ٹکٹکی باندھے مردِ مجاہد کے نظاروں میں گم تھا۔ مجھے مولانا مودودی (مرحوم) یاد آگئے۔ ان میں اور قاضی صاحب میں صرف قد کا فرق تھا۔ باقی جو ہشاشت بشاشت ان دونوں کے پُر رونق چہروں پر تھی وہ ایک جیسی تھی۔ دونوں کی جلد گلابی سفید، دونوں نے داڑھی سفید تر، دونوں نے سر پر ایک جیسی ٹوپی اور عینک پہنی ہوئی تھی۔ کمال کی مشابہت تھی دونوں امیروں میں۔ قاضی صاحب نے اچھی طرح حال چال دریافت کیا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد واپس گھر کے اندر تشریف لے گئے۔

کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ اس لیے جب واپس آئے تو بڑے سے تھال میں پلاؤ، سالن، روٹیاں اور کئی نعمتیں لے کر آئے۔ آتے ہی کہتے ہیں؛ دراصل میرے گھر میں کوئی خادم نہیں ہے اور میں رات کو ہی تونسہ میں ایک جلسہ کر کے روانہ ہوا اور صبح صبح لاہور پہنچا ہوں۔ اس لیے جو بھی کھانا ہے حاضرِ خدمت ہے۔ میں بولا، قاضی صاحب یہ تو بہت بڑی دعوت کا سامان ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا۔ بہر حال کھانا تناول کرنا شروع کیا اور ساتھ ساتھ ہلکی ہلکی باتیں جن میں کچھ سیاسی صورتِ احوال اور کچھ جماعتِ اسلامی کے زیرِ سایہ جمعیت کے متعلق معاملات تھے، ہوتی رہیں۔ پھر جیسے کہ وقت ہو جاتا ہے ہمارا بھی وقت مکمل ہو گیا اور تقریباً 2 گھنٹے کی اس ملاقات کی یادیں ہمیشہ کے لیے اپنے دل و دماغ میں ریکارڈ

کر کے واپس رحمان پورہ میں اپنے گھر آ گئے۔ اللہ غریقِ رحمت کرے، قاضی صاحب کا انتقال 2013 میں اسلام آباد میں ہوا۔

## مولانا اکرم اعوان صاحب (مرحوم)

یہ غالباً 1992 کے اوائل کا ذکر ہے جب میرے قریبی دوست اور کولیگ جناب شرافت علی اعوان صاحب نے منارہ ضلع چکوال میں مولانا اکرم اعوان صاحب سے ملاقات کرنے اور وہاں کچھ دن قیام کرنے کا پروگرام بنایا۔ ہم دونوں چونکہ ان دنوں چھٹی پر لاہور میں تھے۔ اس لیے ایک صبح لاہور سے سرگودھا اور پھر سرگودھا سے براستہ خوشاب ہوتے ہوئے منارہ پہنچے اور کچھ دیر ستانے کے بعد مغرب کی نماز ادا کرنے مسجد میں آ گئے۔ یہ جگہ جہاں مسجد اور حضرت مولانا اکرم اعوان صاحب کی رہائش گاہ بھی تھی، ایک وسیع و عریض قطعہ اور اس میں بنی ہوئی عمارت پر مشتمل تھی۔ قرب و جوار میں چونکہ چونے کے پتھر کے پہاڑ ہیں اور زیادہ تر سرسبز و شاداب، اس لیے باوجود کہ جولائی کا مہینہ تھا پھر بھی شام اور صبح کے وقت اچھی خاصی خنکی محسوس ہوئی۔

نماز مغرب جناب مولانا اکرم اعوان صاحب کی امامت میں باجماعت ادا کی اور اس کے بعد مولانا کا خطاب شروع ہوا جو وقت کی مناسبت سے مختصر ثابت ہوا۔ خطاب تو بے شک مختصر تھا لیکن مولانا کا طرزِ کلام، خوبصورت الفاظ کا استعمال بمعہ ٹھوس دلائل اور آواز کے زیر و بم نے میرے دل پر ٹھیک ٹھاک اثر کیا اور میں نے اپنے وجود میں عجیب طرح کی سنسنی محسوس کی۔ مولانا کا قد کاٹھ

ویسے بھی نکلتا ہوا اور مضبوط تھا۔ اوپر سے اندازِ بیان اور خاص طور پر متاثر کن چھو لینے والے جملے میرے جیسے کم مایہ شخص کے لیے شفایانہ تھپکی کا باعث بنے۔ میں انتہائی بے اختیاری اور یکسوئی کے ساتھ مولانا کو دیکھتا اور سنتا رہا۔ ان کا ادا کردہ ایک ایک لفظ میری رگ و جان میں اتر تا رہا اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ مولانا کے ہاتھ پر باقاعدہ بیعت کر کے مولانا کی جماعت کا حصہ بنوں گا۔

مولانا اکرم اعوان صاحب' مولانا اللہ یار خان صاحب کے نائب تھے اور ان کے انتقال کے بعد مولانا اکرم اعوان جماعتِ اویسیہ کے نگران اور رہنما بنے۔ ہمارے ایک اور کولیگ جناب محمد بوٹا انجم صاحب تھے جو مولانا اکرم اعوان صاحب کے باقاعدہ مریدوں میں سے تھے۔ مولانا اور مولانا کی جماعت کے بارے میں بڑے جوش و خروش سے ہم سب کو معلومات سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ یہ سب جناب محمد بوٹا انجم صاحب کی محنت کا نتیجہ تھا کہ ہمارے فیلڈ کیمپ اور اس سے ملحقہ دفتر میں اچھی خاصی تعداد، افسران اور اسٹاف ممبران کے ذکر و وظائف میں مشغول ہو گئی تھی۔ پنجگانہ نماز کے علاوہ تہجد اور دوسری نفلی عبادات کی طرف رجحان تھا۔ ویسے تو سارا کیمپ ہی الحمد للہ نمازی اور پرہیز گاری کا پابند تھا لیکن جو حضرات مولانا اکرم اعوان کے ساتھ بالمشافہ بیعت یافتہ تھے، وہ سال میں کم از کم ایک بار منارہ کا چکر ضرور لگاتے اور حضرت اکرم اعوان اور ان کے برگذیدہ ساتھیوں کے ساتھ ذکرِ الٰہی (خفی) کی محفلیں سجاتے، اپنے روحانی مقامات اور درجات میں اضافہ کرتے۔ یہی سبب تھا کہ میں اور

شرافت علی اعوان منارہ کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں ایک رات بسر کرنے کے بعد میں تو واپس لاہور آ گیا لیکن شرافت علی اعوان صاحب وہاں کچھ اور دنوں کے لیے رہ گئے۔

مولانا اکرم اعوان سے دوسری ملاقات ان دنوں ہوئی جب میں سرکاری کام کی حیثیت سے پیل پدھرار کے علاقہ میں کیمپ پذیر تھا اور وہاں کے قرب و جوار میں موجود پہاڑی سلسلہ میں سروے کا کام کر رہا تھا۔ ایک یا دو دن کے بعد ہی حضرت اکرم اعوان کو ملنے کے لیے منارہ چلا گیا اور مسجد سے ملحقہ ان کے دفتر کے باہر ان سے ملنے کی اجازت چاہی۔ ایک دربان اندر گیا اور جلد ہی واپس آ کر اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اندر جا کر مولانا کو سلام عرض کیا اور ان کے اشارے کے مطابق زمین پر بچھے قالین پر بیٹھ گیا۔ مولانا لوگوں کے خطوط کے جوابات لکھنے اور لکھانے میں مصروف تھے اور خود بھی نیچے قالین پر بیٹھے تھے۔ چند ایک مددگار بھی تھے جو مولانا کو خطوط کے جوابات لکھنے کے لیے مدد کر رہے تھے۔ اسی دوران میں نے کمرے کا اندرونی نظارہ کرنے کے لیے آنکھیں چاروں طرف گھمانا شروع کر دیں۔ جیسے جیسے کمرے کا نظارہ ہو رہا تھا ویسے ویسے میری حیرانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہاں پر کونے میں موجود مختلف چٹانوں کے نمونے تو تھے ہی لیکن وڈ فوسل اور بون فوسل بھی اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ اس طرح کافی تعداد میں پرانے اور نئے دونوں نوادرات نظر آئے۔ اس دن علم ہوا کہ مولانا حضرت اکرم اعوان صاحب کو جیالوجی کے علوم میں بھی کافی دلچسپی ہے اور بعد میں جب گفتگو

ہوئی تو پتا چلا حضرت صاحب شکار کے بھی شوقین ہیں اور علمِ فلکیات میں بھی کافی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ مولانا اکرم اعوان صاحب کے ساتھ اس کے بعد ملاقاتوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہوا اور ان کے مزاج و عادات کے بارے میں بہت زیادہ آگاہی ہوئی۔ پھر یوں ہوا کہ پیل پدھرار میں قیام کے دوران چھ یا سات جمعۃ المبارک منارہ کی مسجد میں ادا کیے اور حضرت مولانا اکرم اعوان صاحب کے خطبات سنے اور ان کی شخصیت میں چھپے اسرار و رموز سے آگاہ ہونے کا موقع ملا۔

مولانا کے زیرِ ادارت ایک ماہانہ رسالہ المرشد کے نام سے شائع ہوتا ہے جس میں مولانا کی تقاریر اور تحریر پڑھنے والے پر زبردست روحانی اثر کرتے ہیں۔ مولانا لکھاری بھی غضب کے رہے ہیں۔ ان کے لکھے مضامین خاص کر تصوف اور وحدانیت کے اوپر پڑھنے والے پر بہت اثر رکھتے ہیں۔ مولانا کے پیروکاروں کی اچھی خاصی تعداد آج بھی لوگوں کو دعوتِ فکر دیتی ہے اور روحانی منازل طے کرواتی ہے۔ مولانا 7 دسمبر 2017 کو اپنے خالقِ حقیقی کے دربار میں حاضر ہوئے اور پیچھے اپنے عقیدت مندوں کو باقی ماندہ لوگوں کی اصلاح کے لیے تیار کر گئے۔

## عرفان الحق صاحب

جہلم شہر کی اس نابغۂ روزگار شخصیت سے ملاقات جو پہلے پہل ہوئی وہ غالباً 2001ء کے ارضیاتی سروے جو ہم لوگ مرکزی اور شرقی پوٹھوہار میں کر رہے تھے ہوئی اور ملاقات کروانے والے جناب حافظ عبدالرحمٰن صاحب

تھے۔ حافظ عبد الرحمٰن صاحب مسلک کے اعتبار سے اہلِ حدیث ہیں اور کم کم ہی ایسے لوگوں کو ملتے ہیں جو عوام الناس میں تصوف اور معرفت کے علم و افکار کو بیان کرتے ہیں۔ اس وقت ہم دینہ میں کیمپ پذیر تھے اور جہلم کے نواحی علاقوں میں جہاں جہاں پہاڑی سلسلے ہیں گوہرِ مقصود کو ڈھونڈا کرتے تھے۔ ایک دن جب کالا گجراں اور پیر شہاب کے علاقوں میں کام کر رہے تھے تو پروگرام بنایا کہ شہر جہلم میں کچھ سرکاری خرید و فروخت کے بعد جناب عرفان الحق صاحب سے ملاقات کی جائے۔

چنانچہ ٹاہلیانوالہ میں واقع جناب عرفان الحق صاحب کے مہمان خانہ میں گئے اور وہاں سے ٹوکن لے کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔ وقتِ مقررہ پر آواز پڑی کہ فلاں نمبر ٹوکن کی باری آگئی ہے تو ملاقات کر لیں۔ میرا اور حافظ عبد الرحمٰن صاحب کا ٹوکن ایک ہی تھا۔ اس لیے دونوں ایک ساتھ عرفان الحق صاحب کے پاس حاضر ہوئے۔ بالکل اچھوتی شکل و صورت، انتہائی نرم و مشفق شخصیت، خالص پاکستانی گندمی رنگت، گھنی مگر چھنی ہوئی داڑھی، عمر یہی کوئی 55 یا 60 سال ہو گی۔ سفید شلوار قمیض میں ملبوس انتہائی محبت اور چہرے پر بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ مصافحہ کیا اور حال چال پوچھا۔ جب اپنے کلاسیفائیڈ پروجیکٹ کے بارے میں بتایا تو مزاج میں اور بھی محبت اور شدت آگئی اور کہنے لگے ابھی آپ کے آنے سے پہلے جو صاحب اُٹھ کر گئے ہیں وہ بھی بلند پایہ پروجیکٹ کے انچارج تھے اور دعا کے لیے آئے تھے۔ کمرے کا ماحول اور جناب

عرفان الحق صاحب کی گفتگو میں وقت کا پتا بھی نہ چلا کہ کب ختم ہو گیا بس اتنا کہہ سکے کہ حضرت ہمارے لیے بھی دعا کریں کہ جس مقصد کو لے کر یہاں آئے ہیں اللہ اس میں کامیابی دے۔ یہ کہہ کر مگر دل میں مصمم ارادہ کر کے کہ دوبارہ بھی آئیں گے۔ عرفان صاحب سے اجازت لی اور کیمپ واپس آ گئے۔

تقریباً 4سال بعد 2005 میں تحصیل فتح جنگ ضلع اٹک میں اپنے سرکاری کام کے سلسلہ میں زمین کے اندر کھدائی اور نمونہ جات حاصل کرنے کے لیے ایکسپلوریشن سروے کا کام شروع کیا تو وہاں نزدیک ہی کھوڑ اور پنڈی گھیپ کے علاقے بھی ہیں۔ وہاں کی کئی بزرگ شخصیات سے رابطہ ہوا تو ان میں سے ایک صاحب نے جو غالباً 75 یا 80 سال کے تھے لیکن صحت اچھی رکھتے تھے، بالواسطہ ایک واقعہ سنایا کہ کھوڑ میں جب انگریزوں نے تیل کے لیے بڑی بڑی مشینوں کی مدد سے کھدائی کی تو پہلے پہل جناب پیر مہر علی شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کامیابی کے حصول کے لیے دعا کرائی اور ساتھ ہی خوش خبری بھی سنائی۔ نتیجتاً کھوڑ میں تیل کے کامیاب کنوؤں کی کھدائی ہوئی۔ میرا یہ پروجیکٹ بھی کچھ ایسی ہی نوعیت کا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ کیوں نہ جناب عرفان الحق صاحب کے پاس حاضری دی جائے اور اپنی اور اپنے محکمے کی کامیابی کے لیے دعا کروائی جائے لہٰذا میرا دوسرا وزٹ جناب عرفان الحق کی طرف ہوا اور یوں آہستہ آہستہ حضرت عرفان الحق کے پاس آمد و رفت میں تیزی آنے لگی۔ بعد میں کئی افراد میرے ساتھ جہلم گئے اور عرفان الحق صاحب سے شرفِ ملاقات پاتے رہے۔

عرفان الحق صاحب کا طریقۂ کار خالصتاً شرعی رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے کچھ نام اور قرآن پاک کی آیات میں سے چُنی ہوئی آیات جن میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور بڑائی بیان ہوتی ہے، وہ پڑھنے کو دیتے ہیں۔ ایک جمِ غفیر جناب عرفان الحق صاحب سے مستفید ہوتا ہے۔ جناب عرفان الحق صاحب ایک بہترین حکیم بھی ہیں اور روحانی علاج کے ساتھ ساتھ جسمانی علاج کے لیے بھی دوائیں تجویز کرتے ہیں۔

میرے پرانے محلہ دار یٰسین صاحب اللہ جانے اب کہاں ہیں، وہ شروع شروع میں کرکٹ کے بہترین کھلاڑی ہوتے تھے۔ ان کے ساتھ بھی کرکٹ کھیلی اور یہ جان کر انتہائی خوشگوار حیرانی بھی ہوئی کہ وہ لاہور میں وحدت روڈ پر واقع اپنے ایک دوست (ظفر صاحب) کے ہمراہ حضرت عرفان الحق صاحب کی لاہور میں موجودگی کے دوران مہمان نوازی میں شرکت کرتے ہیں۔

دُعا ہے کہ عرفان الحق صاحب اسی طرح خلقِ خدا کی رہنمائی کرتے رہیں اور اپنے درجات بلند کرتے رہیں، آمین ثم آمین!

## ناصر علی قمر صاحب

قارئین کرام لازماً حیرانی میں مبتلا ہوں گے کیونکہ معروف شخصیات کے ذکر کے بعد اچانک ایک غیر معروف شخصیت پیش ہو رہی ہے۔ جو عوام الناس میں تو شاید اتنی جانی پہچانی نہ ہو لیکن میرے نزدیک اور خاص طور پر میرے ہم پیشہ ساتھیوں میں واقعی اتنے خواص اور خوبیوں کی مالک ہونے کی وجہ سے نہایت

اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔ ناصر علی قمر صاحب ایک کلاسیفائیڈ ادارے میں اپنی گوناگوں صلاحیتوں کے بل بوتے پر نہ صرف اعلیٰ عہدوں پر براجمان رہے اور ملک و قوم کی خدمت کرتے رہے بلکہ اپنی انسان دوستی جو ہر قسم کے بغض و عناد اور سماجی اونچ نیچ کے فرق سے مکمل مبرّا تھی اور ہے کی بدولت اس مقام پر فائز ہوئے ہیں اور نابغۂ روزگار شخصیات کا پروفائل آپ پر مکمل فٹ آتا ہے۔

انسان دوستی صرف یہی نہیں ہوتی کہ آپ اپنے ہم نشینوں کے ساتھ گپ شپ لگائیں اور ان کی خوشیوں میں شرکت کریں، علاوہ ازیں ان کے ہنسنے کے ساتھ خوب قہقہے لگائیں اور ان کو شعوری احساس دلائیں کہ آپ ان کے صحیح ہمدرد، مخلص اور دیرپا ساتھی ہیں بلکہ ان کے غم، دکھ، درد اور مصیبت میں بھی اسی شدت کے ساتھ شریک ہوں، ان کے غم کا مداوا کرنے کی کوشش کریں۔ نقصان میں گھرے ہوئے مبتلا کو احساس دلائیں کہ فکر مت کرو یہ لمحات عارضی ہیں اور جلد ہی ان بھنور نما تلاطموں سے نجات مل جائے گی۔ کسی طور پر بھی ان کو قسمت کی سختی یا حالات کے حوالے اکیلا نہ کریں۔ ناصر صاحب میں یہ خوبیاں برابر موجود ہیں کہ جب کسی نے اپنی خوشی میں ان کو یاد کیا تو چاہے موسم کیسا بھی ہو، آندھی، بارش، طوفان کوئی موسمی تغیر ناصر صاحب اپنے آپ کو کسی بھی دوست یا عزیز کی خوشی میں شرکت سے باز نہیں رکھ سکے۔ اسی طرح اگر پریشانی یا غمی نے کسی کا احاطہ کر لیا ہے اور اس کو اخلاقی مدد کی ضرورت ہے جو کہ اس وقت کی سب سے بڑی سپورٹ ہوتی ہے اور بندہ چاہے جتنا مرضی مضبوط دل گردے

کا ہو تمنا کرتا ہے کہ کوئی اس کا غم بانٹے، پوچھے کہ تمھارے ساتھ کیا بیت رہی ہے؟ میرے ساتھ اپنا مکمل غم بانٹو تاکہ تمھارے اندر کا طوفان تمھاری باتوں سے کچھ کم ہو اور تم نارمل ہو تو اس کے ساتھ ناصر علی قمر صاحب کا برتاؤ کچھ اس طرح کا ہوتا کہ بندہ حالتِ غم میں چند لمحات رہتا اور اس کے بعد نارمل طریقے سے پیش آرہا ہوتا تھا۔ میرے والدِ محترم کا انتقال جنوری 1999 میں ہوا۔ میں اس وقت ڈی جی خان میں تھا اور وہاں سے اپنی فیملی کے ہمراہ ساری رات کا سفر کر کے لاہور پہنچا۔ یہاں والد صاحب کے جسدِ خاکی کو دیکھا اور کفن دفن کا انتظام کرنے کی خاطر گھر سے باہر نکلا۔ دفعتاً خیال آیا کہ اپنے لاہور دفتر میں جو میرے جاننے والے ہیں ان کو بھی اطلاع کر دوں یا کم از کم دفتر میں اطلاع دے دوں کہ میرے والد کے جنازے میں جس نے شرکت کرنا ہو وہ آجائے۔ دفتر کے اندر تو نہ جا سکا مگر گیٹ پر موجود ایک شخص کو اطلاع دے کر واپس آگیا اور گھر میں اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر والد صاحب کے جسمِ خاکی کو نہلانے اور کفنانے میں مصروف ہو گیا۔ جمعۃ المبارک کا دن تھا اور رمضان کی 17 تاریخ۔ جب ہم لوگ والد صاحب کا جنازہ لے کر مسجد میں گئے اور مسجد کے مرکزی دروازہ کے باہر جنازہ رکھ کر ایک آدمی کی ڈیوٹی لگا کر مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنے اندر چلے گئے۔

نماز جمعہ کے بعد اور بھی نمازی اکٹھے ہو گئے اور جب انھیں علم ہوا کہ باہر جنازہ تیار ہے تو سب نمازی جنازہ میں شامل ہونا شروع ہو گئے۔ ایک کھلی جگہ پر جنازہ روک کر صفیں سیدھی کی گئیں اور امام صاحب نے کچھ کلمات کہنے کے بعد

تکبیر بلند کی اور کچھ ہی دیر میں نماز ادا ہو گئی۔ نماز جنازہ کے بعد اس سے پہلے کہ جنازہ اُٹھایا جاتا میں نے تیزی کے ساتھ شرکاء جنازہ کے روبرو واشگاف الفاظ میں اپنے والد (مرحوم) کی بابت دریافت کیا کہ کوئی قرضہ وغیرہ اگر ہمارے والد کے ذمہ کسی شخص کا ہے یا کوئی دعوے دار ہے تو وہ تقاضا کر سکتا ہے اس لیے کہ میں اور میرے بھائی یہاں موجود ہیں۔ بہر حال تقاضا کسی نے نہ کیا۔ ویسے ہی والد محترم اپنے معاملات صاف رکھتے تھے اور کسی کے ذمہ ان کا کوئی حق ہوتا تو درگذر کرتے لیکن اگر کسی کا کوئی حق دینے کا کوئی معاملہ ہوتا تو حق دار کا حق لوٹانے میں ایک ساعت بھی نہ لگاتے۔ اب یہاں تک جب معاملہ پہنچ گیا اور کسی نے تقاضا بھی نہ کیا تو رات بھر جاگ کر سفر کرنے اور باپ کے بچھڑنے کے غم کی وجہ سے میرے اپنے حواس کمزور پڑنا شروع ہو گئے اور ایسا لگا جیسے تمام تر جسمانی اور روحانی طاقتیں کمزور پڑ گئی ہیں اور اب مزید پُر اعتمادی سے بولنا اور معاملات پر گرفت کرنا آسان نہیں رہا۔ بلکہ یوں سمجھیں جیسے مجھے کسی سہارے کی اشد ضرورت پڑ گئی ہو اور روکے ہوئے جذبات جو آنکھوں میں رکے ہوئے آنسوؤں کا روپ دھارے ہوئے تھے چھلکنے کو تیار تھے کہ دفعتاً ایک ہاتھ میرے کندھے پر ہولے سے آیا اور میرے کندھے کو تھپکانے لگا۔ میری جذباتی کیفیت جو تقریباً ابرِ رواں بن کر کچھ دیر کے لیے چھم چھم آنسوؤں کی برسات لگایا چاہتی تھی یکدم مضبوط ہو گئی اور مجھے ایسا لگا جیسے مجھے کوئی بہت مضبوط سہارا مل گیا اور میری خود اعتمادی واپس آنا شروع ہو گئی۔ پلٹ کر دیکھا تو کوئی اور نہیں تھا سوائے جناب ناصر

علی قمر صاحب کے۔ میری آنکھیں جب ناصر صاحب کی آنکھوں سے ٹکرائیں تو نامعلوم ذرائع سے اپنے اندر ایک طاقت محسوس کرنے لگا اور چند ساعت پہلے والی خستہ حالت کو ایک مضبوط اعصاب والے عباس قریشی میں ڈھلتے ہوئے پایا۔ اللہ خوش رکھے یہ معاملہ صرف مجھ تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ جو بھی ہمارا کولیگ ایسی غم زدہ صورت حال میں سے گزرتا، اس کو ناصر علی قمر صاحب کی ڈھارس بندھاتی ذات ملتی اور وہ اپنے آپ کو بے سہارانہ سمجھتا۔

ناصر علی قمر صاحب کی شخصیت کا ایک نہایت روشن پہلو یہ بھی ہے کہ جب کسی کو مشورہ کی ضرورت پڑتی تو بہترین قابل عمل مشورہ سے نوازتے ہیں۔ میں اس وقت اپنا گھر تعمیر کروا رہا تھا اور حسبِ معاملہ جو سرکاری ملازم کے ساتھ ہوتا ہے بجٹ میں کوئی گڑبڑ ہو گئی اور قرضہ لینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ناصر صاحب سے بات کی تو ناصر صاحب نے ایک تو جسیم الدین (مرحوم) ہمارے سینئر کولیگ تھے اور بہت اللہ لوک، ان کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔ ان کے پاس گیا تو انھوں نے بغیر کوئی بات پوچھے ایک رجسٹر میرے آگے کر دیا کہ اس میں رقم جو چاہیے اور واپس کب ہو گی کے بارے معلومات درج کر دیں۔ مجھے ایک لاکھ روپیہ چاہیے تھا وہ اس عمل کے ذریعے حاصل کیا اور جسیم الدین صاحب کا شکریہ ادا کر کے ساتھ ساتھ ناصر علی قمر صاحب کا بھی شکریہ ادا کیا جن کے مشورہ کی بدولت مجھے بینک کے سود والے قرضہ کی بجائے قرضِ حسنہ مل گیا۔

میری خوش قسمتی یہ بھی رہی کہ مجھے ناصر صاحب کی لیڈرشپ میں ان

کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ جتنا اعتماد ناصر صاحب کے دور میں مجھے اور میرے رفقاء کار کو ملا شاید ہی کسی اور افسر کے زیرِ سایہ کام کر کے ملا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ رپورٹ رائٹنگ میں ایک حد تک کمال حاصل کرنے کے بعد مختلف موضوعات پر تحقیقاتی پیپر لکھنا شروع کیے۔ وہ علیحدہ بات ہے کہ معاملات Synopsis تک ہی محدود رہے لیکن مکمل طریقۂ کار تک رسائی اور پہنچ ہو گئی۔ قصہ مختصر کہ فیلڈ ورک کو فیلڈ رپورٹس اور تحقیقاتی رسائل تک پہنچانے کا صحیح حق ادا ہوا تو ناصر صاحب کی راہنمائی میں ہوا۔

علاوہ ازیں ایک بار مجھے بینک سٹیٹمنٹ کے لیے کچھ رقم درکار تھی۔ ناصر صاحب ریٹائرڈ ہو چکے تھے۔ غالباً یہ 2016 کی بات ہے اور ناصر صاحب 2012 میں ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ میں نے ناصر صاحب سے بات کی کہ کچھ دوستوں نے کافی رقوم مہیا کی ہے لیکن پھر بھی کچھ اضافی رقم چاہیے۔ کمال ہے جو ناصر صاحب نے کسی قسم کا کوئی بہانہ تراشا ہو حالانکہ ریٹائرڈ تھے اور کچھ بھی کہہ سکتے تھے لیکن کہنے لگے آٹھ یا دس دن تک آجاؤ اور کیش لے جاؤ۔ میں دسویں دن ان کے گھر پہنچا تو چائے پلانے کے بعد پانچ لاکھ کی رقم کیش میں لے آئے اور کہنے لگے، معذرت کے ساتھ اتنے دن لگ گئے دراصل میں روزانہ بینک سے ATM کے ذریعے پچاس ہزار نکلواتا رہا ہوں اور آج مطلوبہ رقم دستیاب ہو گئی ہے۔ قربان جائیے ایسی ہمدرد شخصیت کے کہ انکار بھی نہیں کیا اور اتنی محنت بھی کی صرف اور صرف میری ضرورت پوری کرنے کے لیے۔

ناصر علی قمر صاحب کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ اپنے والد کی وفات کے بعد اپنے خاندان خصوصاً بہنوں بھائیوں کی تعلیمی اور شادی بیاہ کے حوالے سے تمام اخلاقی و مالی ضروریات بطریق احسن نبھاتے رہے۔ جس طرح ناصر علی قمر صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ نے والدۂ محترمہ جو کہ الزائمر ڈیمنشیا (Alzheimer Dementia) کی مریضہ تھیں اور کئی سال تک اپنے حواس میں نہ ہونے کے باعث صاحبِ فراش تھیں، کی جس انداز سے ان کو سنبھالنے، کھانا کھلانے اور نہلانے دھلانے کی خدمات سرانجام دیتے رہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اسی طرح گزشتہ دو سالوں میں کامہ کی حالت میں امریکہ میں ناصر صاحب اپنی خوش دامن کو اپنی بیگم کے ساتھ مل کر آخری سانس تک صبر و استقامت سے خدمت کرتے رہے، وہ قابلِ ذکر ہے۔

ایک دن میں نے ناصر صاحب کو کہا کہ سر آپ اپنی والدہ کی بہت خدمت کرتے ہیں تو یقیناً نیکی کی بوریاں خوب خوب بھرتے ہیں۔ اللہ یقیناً آپ سے بہت خوش ہوں گے تو جو جواب ناصر صاحب نے مجھے دیا وہ مجھے پوری طرح لاجواب کر گیا اور ابھی تک میرے پاس اس جواب کا کوئی جواب نہیں۔

بقول ناصر صاحب کے اگر ماں کی خدمت کرنے میں نیکی کی بوریاں سمیٹنے اور اللہ کی خوشنودی کا ذکر نہ ہو تو کیا ماں باپ کو اس حالت میں چھوڑ دیا جاتا ہے؟ نیکی ہو یا نہ ہو ماں باپ کے ساتھ ہر حال میں عزت، تعظیم، خدمت اور محبت سے پیش آنا اولاد کے لیے عین فرض ہے۔ بہت بعد میں جب میں نے قرآن پاک کی

آیت (بنی اسرائیل، آیت 24) پڑھی تو بہت کچھ معلوم ہو گیا۔ ناصر علی قمر صاحب کے تین بچے ہیں اور تینوں ماشاء اللہ سے بہترین تربیت یافتہ، خوش اخلاق، ہنس مکھ اور صحیح معنوں میں ناصر صاحب کے جانشین ہیں۔ بڑا بیٹا ان دنوں چین میں تھا جب 2009 میں ہم سرکاری طور پر چین گئے اور جس جوش و خروش سے وہ ہمیں ملنے آیا اور بعد میں بھی گاہے بگاہے ملتا رہا انتہائی قابلِ تحسین ہے۔

## کمانڈر محمد اویس قریشی صاحب

کمانڈر صاحب میرے سب سے بڑے بھائی ہیں اور اپنی بے شمار ظاہری اور چھپی ہوئی صلاحیتوں کی وجہ سے ایک نابغۂ روزگار شخصیت ہیں۔ کمانڈر صاحب ہم چھ بھائیوں میں چونکہ سب سے بڑے ہیں۔ اس لیے بچپن سے ہی کمانڈر کے عہدہ پر براجمان رہے گو کمیشن ان کو تقریباً 22 سال کے بعد ملا اور تعیناتی پاکستان نیوی میں ہوئی۔ کچھ تو سب بھائیوں سے سینئر ہونے کا خداوندی عطیہ اور کچھ بھائی صاحب میں چھپی ہوئی قائدانہ صفات کہ جب تک میں اور محمد الیاس قریشی صاحب مجھ سے بڑے اور کمانڈر صاحب سے چھوٹے، والد صاحب کی جاری اولاد میں اولادِ نرینہ گروپ میں تھے تو کمانڈر صاحب کی کمانڈری اور رعب و دبدبہ کو بلا عذر تسلیم کیے ہوئے تھے۔ گھر میں سائیکل سب سے پہلے کمانڈر صاحب کو تفویض کی گئی اور ہم دونوں چھوٹوں کو اس وقت چلانے کی اجازت ہوتی جب کمانڈر صاحب اجازت دیتے۔ اسی طرح جب والد محترم کے سکوٹر پر آگے پیچھے بیٹھ کر فوٹو کھنچوانے کا وقت آتا تو کمانڈر صاحب اگلی سیٹ یعنی سٹیرنگ والی سیٹ

پر براجمان ہوتے اور میں اور محمد الیاس قریشی صاحب پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر کمانڈر صاحب کو پورا پورا پروٹوکول دیتے۔ کمانڈر صاحب بچپن سے ہی سٹریٹیجکل جینئس تھے۔ ایک دفعہ ہم اپنے گھر کی چھت پر دھاگہ کو مانجا لگا کر پتنگ بازی کے لیے ڈور بنا رہے تھے اور چونکہ اس عمل میں کافی فاصلہ درکار ہوتا ہے تاکہ ڈور جلدی سے سوکھ جائے اور اس کی کوالٹی میں بہتری آئے، اس لیے ہم نے اپنے چھت سے دوسرے ہمسائے کی چھت تک ڈور مانجنے کا میدان بنایا۔ اب جب ہمارے چلنے کی آوازیں نیچے ہمسایوں کو محسوس ہوتیں تو ایک صاحب جن کا نام خورشید تھا بڑے غصے والی شکل بنا کر اوپر چھت پر آئے تو کمانڈر صاحب کا خوشگوار موڈ ناخوشگواری میں بدل گیا اور میرے ساتھ کچھ ہی دیر پہلے جو میٹھی میٹھی اور دوستانہ باتیں کر رہے تھے اچانک غصہ میں کاشن دینا شروع کر دیا۔ اپنے چہرے کا رنگ سرخ کرتے ہوئے مجھے ڈانٹنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی آواز بھی بہت بھاری کر لی۔ میں کچھ سمجھ نہ سکا کہ بھائی اچھے خاصے موڈ میں تھے اچانک کیا ہوا اور حکمی تحکمی کیوں شروع کر دی۔ یہ عمل کوئی لگ بھگ پانچ منٹ چلتا رہا لیکن بھائی نے اس طرح کا موڈ دکھایا کہ خورشید صاحب جو ہم سے پچیس تیس سال بڑے تھے اور بڑی شد و مد سے ہمیں ڈرانے کے لیے یا ہمارے عمل سے ہمیں باز کرنے کے لیے آئے تھے، خاموشی سے ہمیں دیکھتے رہے اور بغیر کوئی بات منہ سے نکالے جس تیزی سے آئے تھے اسی تیزی سے واپس نیچے چلے گئے۔ ان کا ایک جملہ جو غالباً انھوں نے اپنی بہادری اور جرأت مندی جو کہ وہ دکھا نہ سکے

تھے نیچے منہ کر کے اپنے بھیجنے والوں کو کہا کہ بچے ہیں مانجا لگا رہے ہیں۔ ہم بھی کبھی لگاتے تھے۔ جیسے ہی وہ منظر سے غائب ہوئے کمانڈر صاحب بھی نارمل پوزیشن میں آ گئے اور پہلے کی طرح ہنس ہنس کر میٹھے انداز میں باتیں کرنا شروع ہو گئے۔ میں چونکہ اس معاملہ کو بالکل نہ سمجھ سکا کہ اس 180 ڈگری کے اُلٹ پھیر کا مطلب کیا ہے تو کمانڈر صاحب نے مجھے سمجھایا کہ وہ خورشید صاحب ہم پر اپنا رعب جمانے آئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ بلاسٹ کرتے میں نے پہلے ہی کارروائی ڈال دی اور انھوں نے جب دیکھا کہ بڑا لڑکا کافی ہائپر ہوا ہوا ہے تو بہتری یہی ہے کہ اس سے پنگا نہ لیا جائے اور وہ واپس چلا گیا۔ یہ غالباً بھائی صاحب کی پہلی بھرپور گولہ باری تھی جس کا نتیجہ ہمارے حق میں آیا اور میں کمانڈر صاحب کو چھپا ہوا سلیوٹ مارنے پر مجبور ہو گیا۔

کمانڈر صاحب کا غصہ بھی کچھ وقت سے پہلے آ گیا تھا اور اس کا پہلے پہل شکار ایک آوارہ بِلا بنا تھا۔ وہ اس طرح سے کہ کمانڈر صاحب نے کچھ نایاب اور مہنگے پرندوں کے انڈے دور دراز کے علاقوں سے بڑے مہنگے داموں خریدے اور مرغی جو اپنے انڈوں پر چوزے نکالنے کے لیے بیٹھی تھی اس کے انڈوں کے ساتھ ملا کر رکھ دیے۔ مقررہ دنوں کے بعد بہت ہی خوبصورت چوزے نکلے اور پھر کچھ ہی دنوں میں جوان ہو گئے۔ یہ پرندے جن کو مقامی زبان میں چکور کہا جاتا ہے اور یہ مرغی کے قد کے برابر ہوتے ہیں اور بہت ہی خوبصورت اور پھرتیلے بھی، یہ غالباً ایک درجن کے قریب تھے اور جب چھت سے اکٹھے زمین پر اترتے

تو ان کی یکساں اُڑان سے چھاؤں ہو جاتی اور منظر بہت ہی خوبصورت لگتا۔ شومئ قسمت کہ ان کے ڈربے میں ایک رات کوئی آوارہ بلا گھس گیا اور ایک آدھ کو ہڑپ کرنے کے ساتھ تین چار کو زخمی کر گیا جو بعد میں مر گئے اور باقی انتہائی خوف زدہ ہو گئے۔ قصہ مختصر کہ چکور پرندے کسی بد نظری کا شکار ہو گئے اور کمانڈر صاحب کا شغل خراب ہو گیا۔ کمانڈر صاحب کو اپنے پرندوں کا یوں زوال ہضم نہ ہوا اور انھوں نے اس بلے کو مزہ چکھانے بلکہ ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنانا شروع کر دیا چنانچہ اس کی نقل و حرکت کے بارے میں انتہائی خفیہ طریقے سے CID شروع کی گئی اور ساتھ ہی چھرے والی ائیر گن بھی فل لوڈ کر کے اپنے پاس رکھنے لگے۔ ایک دن بِلا کمال جرأت اور بے باکی سے دن دیہاڑے چکوروں کے پاس آیا ہی چاہتا تھا کہ کمانڈر صاحب جو مچان لگائے بیٹھے تھے، ان کی ائیر گن کے نشانے پر آ گیا۔ ساتھ ہی فائر ہوا اور بِلا دھڑام سے زمین پر۔ چھرا اُس کی کنپٹی پر لگا جس کی وجہ سے اس کی موت فوراً ہی واقع ہو گئی۔ بہر حال کمانڈر صاحب کا غصہ بھی ٹھنڈا ہو گیا لیکن بعد میں افسردہ بھی ہو گئے کہ ناحق اس بِلے کی جان لی۔ اس کے بعد کمانڈر صاحب کا چکور پالنے والا مشغلہ بھی کسی حد تک ختم ہو گیا۔

کمانڈر صاحب کو بچپن ہی سے انجینئر بننے کا شوق تھا اور غالباً آپ الیکٹریکل انجینئر بننا چاہتے تھے کیونکہ وہ الیکٹرک اور الیکٹرونکس عوامل کو بہت گہرائی کے ساتھ دیکھتے اور پرکھنے کی کوشش کرتے کہ اپنی طرف سے بھی کوئی Innovative کام کیا جائے۔ ایک دفعہ ہمارے آبائی گھر رحمان پورہ کوارٹرز

لاہور میں بجلی کے میٹر کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ پھر کچھ اچھوتا خیال ذہن میں آیا تو کہیں سے ایک ٹکڑا بجلی کی تار کا لیا، اس کا ایک سرا کمال فنکاری سے بجلی کے میٹر جہاں سے گھر بجلی سپلائی ہوتی ہے، اس میں جوڑا اور دوسرا سرا گھر میں لگی لوہے کی بیس پچیس فٹ لمبی لوہے کی تار جو گھر میں کپڑے سُکھانے کے لیے استعمال ہوتی ہے، اس میں لگا دی۔ اب سرکٹ مکمل ہو گیا اور کپڑے سکھانے والی تار میں بھی 240 وولٹ بجلی گزرنے لگی۔ ابھی تک تو کوئی خطرناک بات نہ ہوئی اور حالات کنٹرول میں تھے لیکن بعد میں کمانڈر صاحب نے ایک اور لوہے کی تار تین یا چار فٹ لمبی کو اس کپڑے سکھانے والی تار پر پھینکا تو بس ایک دھماکہ ہوا اور جو بھی کمروں میں آرام سے بیٹھا ہوا تھا فوراً پھٹی آنکھوں اور دھونکنی نما جلنے کے سانس کے ساتھ باہر آیا۔ دور دیکھا کہ کمانڈر صاحب خود بھی ڈر کے مارے ایک سمت میں بیٹھے ہوئے ہیں اور اپنے تجربے کے اس غیر یقینی نتیجے سے بری طرح خوفزدہ ہیں۔ باجی ریحانہ اللہ غریقِ رحمت کرے، کمانڈر صاحب سے بہت پیار کرتی تھیں وہ فوراً کمانڈر صاحب کی طرف لپکیں، ان کا سر گود میں لیا اور پانی وغیرہ پلا کر اوسان ٹھیک کیے۔ اس تجربہ سے گھر کے بجلی کے نظام پر بڑا اثر پڑا اور نتیجتاً دو گھنٹے تک بجلی بحال نہ ہو سکی۔

کمانڈر صاحب کا ایک کارنامہ جو آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا وہ بھی بیان کے قابل ہے۔ کمانڈر صاحب نے اپنی سائیکل کا ستعمال عین دوپہر کے وقت کرنا شروع کر دیا۔ ہوا یوں کہ ایک دن ہمارے گھر کے نزدیک ہی نیشنل

الیکٹرونکس جو بعد میں RGA کے نام سے ریڈیو اور ٹیلی ویژن بنانے والی فیکٹری تھی اور اولڈ مسلم ٹاؤن میں واقع تھی، وہاں کا چکر لگا آئے۔ اس فیکٹری کے گاربیج احاطہ میں جس میں ناکارہ یا غیر ضروری اشیاء ہوتی تھیں، وہاں پر کہیں کمانڈر صاحب کا گذر ہوا اور کمانڈر صاحب نے وہاں سے ایک ٹرانزسٹر اور ایک چھوٹی کوائل ڈھونڈلی۔ الیکٹرونکس سے دلچسپی تو تھی ہی لہٰذا اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے اس ٹرانزسٹر اور کوائل کو آپس میں جوڑ کر ایک سرکٹ تیار کر لیا۔ بعد میں اپنی سائیکل چلائی اور وہاں سے کسی دکان سے ایک ریسیور جس کی قیمت تقریباً دو اڑھائی روپے تھی خرید لیا۔ گھر آکر اس ریسیور کو ٹرانزسٹر اور کوائل والے سرکٹ کے ساتھ جوڑا۔ یہ تقریباً ایک ریڈیو سیٹ کا سرکٹ تھا۔ اس ریڈیو سیٹ کے سرکٹ کو ایک ایریل کنکشن دیا اور اس ایریل کو گھر کی چھت پر فٹ کر دیا۔ دوسرا کنکشن ارتھ کا بنایا اور اس کو گھر میں نصب ہینڈ پمپ کے ساتھ لگا دیا۔ اس پورے نظام کو مکمل کرنے کے بعد جب ریسیور کو کان سے لگایا تو جناب ریڈیو پاکستان لاہور میں گونجنے والے اشتہارات اور بعد میں موسیقی آنا شروع ہو گئی۔ یہ ناقابلِ یقین مظاہرہ ہم نے بھی محسوس کیا اور اس ایک ریسیور کو اپنے دائیں کان میں اچھی طرح اور بعد ازاں بائیں کان کے ساتھ لگا کر ایک بینڈ ریڈیو کا مزہ لیا۔ ہم بھائی بہت خوش اور ایسی ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہو گئے کہ مارکونی کیا ہوا ہو گا۔ جناب اب سارے بھائی باری باری لاہور ریڈیو کی نشریات کو مزے لے کر سن رہے تھے۔ اب کمانڈر صاحب نے خیال ظاہر کیا کہ چونکہ اس ریڈیو سیٹ میں کوئی بیٹری سیل نہیں ہے

اس لیے انڈیا کا ریڈیو نہیں آرہا چنانچہ ہال روڈ سے ایک عدد سیل اور گیج خرید ا گیا۔ اس کو اس کنکشن میں جوڑا گیا اور دو بینڈ کا واشگاف آواز ولا ریڈیو سیٹ تیار ہو گیا۔ مجھے آج تک اس بات کی سمجھ نہیں آئی کہ بغیر بیٹری سیل کے ایک بینڈ والا ریڈیو کیسے فنکشننگ تھا۔ بس ایک ہی بات ذہن میں آتی ہے کہ چھت والا ایریل اور ہینڈ پمپ والی ارتھ ان دونوں نے اتنی انرجی مہیا کی کہ مدھم آواز پیدا ہوئی اور جیسے ہی بیٹری سیل اس سسٹم میں نصب کیا گیا، اس نے کئی گنا انرجی مہیا کی اور آواز بھی تیز ہو گئی۔ بہر حال کمانڈر صاحب ایک ریڈیو سیٹ بنانے میں کامیاب رہے۔

کمانڈر صاحب بہادر بھی بہت تھے۔ اپنے سے بڑے قد کاٹھ والے سے اگر لڑائی ہو گئی تو پیچھے نہیں ہٹے۔ بے شک ایک آدھ تھپڑ یا مکہ زیادہ کھا لیا لیکن میدان سے نہیں بھاگے اور نہ ہی پیٹھ دکھائی۔ کمانڈر صاحب ان دنوں غالباً BSc کے فائنل ائیر میں تھے اور میں فرسٹ ائیر میں گورنمنٹ کالج آف سائنس وحدت روڈ میں پڑھتا تھا۔ جب NCC کی پریڈ کے بعد ایک لمبے تڑنگے غنڈہ ٹائپ سینئر طالب علم نے میرے سر سے NCC کی ٹوپی اتاری اور ڈھٹائی سے اپنے سر پر رکھ لی تو میں نے کہا، میری ٹوپی واپس کرو۔ مگر اس نے انتہائی بے شرمی سے سنی ان سنی کر دی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ٹوپی پر قبضہ جمانا چاہتا تھا۔ میں مسلسل اس سے ٹوپی کی واپسی کا تقاضا کر رہا تھا اور وہ کمال بے نیازی کا سلوک روا رکھے ہوئے تھا۔ اسی اثنا میں کمانڈر صاحب بھی اسی جگہ آ گئے اور جب انھوں نے دیکھا کہ لمبا تڑنگا طالب علم بدمعاشی کر رہا ہے تو اسے ایک ہی کاشن میں ٹوپی واپس

کرنے کا کہا اور اس نے ٹوپی واپس بھی کر دی۔

یہ بہادری ہی تھی کہ کمانڈر صاحب پاک نیوی میں چُنے گئے اور پھر گھر سے باہر کراچی میں بحیرۂ عرب میں مدتوں خدمات سرانجام دیتے رہے۔ کمانڈر صاحب جب گوادر میں تعینات تھے تو سمندری دفاعی ذمہ داریوں کو بہت احسن طریقے سے نبھایا۔ بقول ان کے ایک دفعہ رات کے وقت دشمن اپنے جدید ترین بحری جہاز کو گوادر کی بندرگاہ کے قریب پاکستانی حدود میں لے آیا۔ قریب تھا کہ پاکستان بحری دفاعی لائن کراس کرتا کمانڈر نے اپنی چھوٹی سی دفاعی کشتی غالباً فریگیٹ تھی، اس سے بے تحاشا فائرنگ کی اور دشمن کو احساس دلایا کہ پاکستانی نیوی اپنے فرائض سے غافل نہیں اور نہ ہی سو رہی ہے۔ کمانڈر صاحب نے پوزیشن بدل بدل کر اتنی اندھا دھند فائرنگ کی کہ دشمن سمجھا کہ اس کا پالا ایک سے زیادہ دفاعی کشتیوں سے پڑا ہے اس لیے اس نے بھاگنے میں ہی عافیت سمجھی۔

کمانڈر صاحب ہم چھ بھائیوں میں سے واحد بھائی ہیں جن کی شادی پر دادا جان نے چونیوں، اٹھنیوں اور دوسری دھاتی کرنسی والے سکوں کو اچھالا تھا۔ اس عمل کو عرف عام میں 'چھٹا' کہا جاتا ہے۔ آج کل بھی لوگ اکثر گاؤں میں روپے لُٹاتے ہیں لیکن یہ رواج بہت کم ہو گیا ہے۔ جب کمانڈر صاحب کی شادی ہوئی غالباً 1984 میں تو چھٹا ہوتا تھا۔ داداجان نے بہت سالوں تک ایک گتھی میں روزانہ چوّنیاں اور اٹھنّیاں اکٹھی کی تھیں۔ میں نے ایک دفعہ ایک اٹھنّی مانگی تو کہنے

لگے، یہ میں نہیں دے سکتا یہ کسی خاص کام کے لیے اکٹھی کی ہوئی ہیں اور جب دادا جان نے کمانڈر صاحب کی بارات کے ساتھ جاتے ہوئے ان چونّیوں اور اٹھنّیوں کا چھٹا بار بار لگایا اور گلی محلے کے لڑکے بالے ان سکوں کو پکڑنے کے لیے دھما چوکڑی مچانے لگے تو نہایت نا قابلِ فراموش منظر کشی ہونے لگی۔

کمانڈر صاحب بفضلِ خدا ابھی حیات ہیں اور اللہ ان کو عمرِ خضر عطا فرمائے۔ بہت بہترین بڑھاپے والی زندگی گزار رہے ہیں۔

کمانڈر صاحب بڑے بھائی ہونے کی حیثیت سے والدِ محترم کے قائم مقام ہونے کا شرف رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ سب سے پہلے مجھے مسجد میں اپنے ہمراہ لے کر جانے اور فجر کی نماز باجماعت ادا کرنے میں میرا رہنما بننے کا شرف کمانڈر صاحب کو ہی ہے۔ ہم دونوں بھائی اپنے محلے کی مسجد میں صبح فجر کی اذان سن کر پہنچ جاتے اور خالی صف میں بیٹھ جاتے۔ امام صاحب کی آمد کے ساتھ سنتیں پڑھتے اور بعد ازاں ان کی امامت میں فجر کی نماز باجماعت ادا کرتے۔ بعد میں بھی جب دوسری نمازوں کے اوقات میں ہم اکٹھے ہوتے تو مسجد میں باقاعدہ ساتھ جاتے۔ اس طرح سے کمانڈر صاحب نے صحیح معنوں میں حقِ رہنمائی ادا کیا اور اس کی شروعات اپنے گھر سے کی۔

کمانڈر صاحب اپنی جوانی کے انتہائی ایام میں صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے اور ماشاءاللہ صحیح معنوں میں بقول شیخ سعدی:

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری

وقت پیری گرگ ظالم میشود پرہیز گار

کا نمونہ رہے۔ پھر بندوبستِ روزگار بھی ایسی جگہ ہوا جہاں غازی اور شہید دونوں مدارجِ عظیم موجود ہیں۔ اور اب توماشاء اللہ آتشِ جذبِ روحانیت اس مقامِ بالا پر ہے جہاں مردِ مومن کی دھاڑ اور نگاہوں کی چمک کسی بھی ملنے والے کے دل پر ایسی دھاک بٹھاتی ہے کہ بقول شاعر:

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن

ملا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور

اسی طرح سے بطفیل باری تعالیٰ زندگی کے سرد و گرم راستوں کے لیے بہترین ہمسفر ملا جس کے وسیلہ سے جو گھرانہ معرضِ وجود میں آیا اس کو دیکھ کر بجا طور پر یہ احساس ہوتا ہے کہ کمانڈر صاحب بلاشبہ راہِ حق کے مسافر ہیں اور سفر کی کج رویوں سے محفوظ ہیں۔ اب جبکہ سورج اپنی روشنی و حرارت بکھیرنے کی معراج حاصل کر چکا ہے تو رقیق قلب کا شاندار ایوارڈ رب جلیل سے عطا ہوا ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی نہ صرف ادائیگی بلکہ ذکر ہی آنکھوں سے برسات جاری و ساری کروا دیتا ہے۔

## خالد جاوید اختر بھٹی صاحب

میرے ایک بہت پرانے دوست ہیں جو کہ میرے 1978 سے کلاس فیلو بھی ہیں۔ ہم نے اکٹھے ہی MSc جیالوجی پنجاب یونیورسٹی سے مکمل کی ہے۔ ان کا پورا نام خالد جاوید اختر بھٹی ہے اور تعلق ضلع سیالکوٹ سے ہے۔ یہ بھٹی صاحب

ابرار الحق جو کہ مشہور گویے ہیں ان کے بھٹی صاحب سے بالکل اُلٹ ہیں۔ انتہائی شریف، کم گو، نیک، عبادت گزار اور ملنسار، خالد بھٹی صاحب اپنی پرو فیشنل زندگی میں ایک اعلیٰ مقام پر فائز رہے اور ملک و قوم کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دیتے رہے۔

گو ہم ایک عرصۂ دراز تک ایک ہی محکمہ میں اور ایک ہی ڈویژن میں تعینات رہے لیکن زندگی کی فلم میں ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ چھیڑ چھاڑ یا حیران کن کردار ادا کرنے سے قاصر رہے۔ باہمی محبت اور احترام کے رشتہ میں بندھے رہے۔ بھٹی صاحب کو اکثر میں نے ان کی کم گوئی کی خاصیت کی وجہ سے ''میسنا'' بھٹی کا نام بھی دیا ہوا تھا جو کہ کافی زباں زدِ عام رہا۔

خالد بھٹی صاحب بمعہ ہم سب کے ایک وقت میں ''تصوف'' سے کافی دلچسپی رکھتے تھے بلکہ یوں سمجھیں کہ اچھے خاصے تصوف زدہ تھے۔ یہ تصوف سے جُڑی عبادات کا اثر تھا کہ ہم سب سکونِ قلب کے معاملے میں کافی آگے جا چکے تھے بلکہ بھٹی صاحب تو رقیق قلب کی کیفیت میں مبتلا ہو چکے تھے۔ ایک دن ہم سب فیلڈ افسران اپنے کیمپ سے سائیٹ پر ایک ہی ڈبل کیبن میں جا رہے تھے کہ بھٹی صاحب کو رقیق قلب کی کیفیت میں مبتلا دیکھا۔ بات کو آگے بڑھانے سے پہلے ایک بات کا اظہار کرنا ضروری ہے۔ بھٹی صاحب کچھ ہی ماہ ہوئے چین سے واپس آئے تھے اور اپنے ہمراہ ایک نہایت خوبصورت، دیدہ زیب اور طاقت و گنجائش والا، دو بینڈ والا ٹرانزسٹر لائے تھے۔ مجھے یہ ریڈیو سیٹ بہت اچھا لگا، خاص

طور پر کرکٹ کی کمنٹری اس میں بہت صاف اور واضح آواز میں سننے کو ملتی تھی۔ میں خالد بھٹی صاحب سے وقتاً فوقتاً اصرار کرتا کہ یہ ریڈیو سیٹ مجھے دے دیں یا تو تحفہ کے طور پر یا نقد قیمت لے لیں لیکن بھٹی صاحب نہیں مانتے تھے۔ میرا اصرار بڑھتا رہا اور ان کا انکار بھی، یوں ہوا کہ میں بھی ضد کر کر کے تھک گیا اور اصرار کرنا بند کر دیا لیکن ریڈیو سیٹ دل کو اتنا بھا گیا تھا کہ اس کی چاہت اور اس کی طلب برابر قائم رہی اور ساتھ ساتھ جب بھی موقع ملتا میں بھٹی صاحب سے اس ریڈیو سیٹ کو مانگنے میں کبھی تامل نہ کرتا۔

اب جونہی بھٹی صاحب کی قلبی کیفیت رقیقی حالت میں ڈوبی تو بھٹی صاحب نے باقاعدہ خطبہ ارشاد کرنا شروع کر دیا جو کچھ یوں تھا کہ ہماری عمریں بہت ہو گئی ہیں اور ہم کبھی بھی فرشتہ اجل سے ہاتھ ملانے والے ہیں تو ہمیں کچھ آخرت کا سامان کرنا چاہیے اور توبہ کے دروازے بند ہونے سے پہلے پہلے اللہ تعالیٰ کو راضی کر لینا چاہیے اور دنیا داری بس واجبی سی رکھنی چاہیے غرضیکہ خالد بھٹی صاحب کسی منجھے ہوئے خطیب کی طرح دنیا سے بے ربطگی اور اللہ تعالیٰ سے جُڑنے کا لیکچر دے رہے تھے لیکن ایک جملہ ان کے وعظ کا خصوصی حصہ بن کر بار بار سننے کو مل رہا تھا کہ ہم نے جلد ہی مر جانا ہے۔ غریقِ رحمت ہو جانا ہے اس لیے سارے گناہوں سے توبہ کر لیں اور نیک کام شروع کر دیں۔

اب ہم پانچ چھ افسران جو گاڑی میں بیٹھے تھے۔ نیم مدہوشی کے عالم میں لیکچر سن رہے تھے اور بالکل خاموشی کے ساتھ بھٹی صاحب کو فراخدلانہ وقت

دے رہے تھے کہ وہ اپنی قلبی کیفیت کو آشکار کرنے میں کوئی دقت محسوس نہ کریں۔ میں چونکہ ان کے ساتھ ہی بیٹھا تھا لہٰذا ایک ایک لفظ اچھی طرح سن رہا تھا۔ اپنے وعظ کی گردان میں جب وہ ایک بار پھر اس جملہ کی طرف آئے کہ ہم نے جلد ہی مر جانا ہے تو مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے فوراً ان کی بات کاٹ کر ذرا اونچی آواز میں ہانک لگائی کہ یار بھٹی مرنے سے پہلے وہ ریڈیو سیٹ مجھے دے جانا، تمھارے کس کام کا؟ اس بات کا سننا تھا کہ جیسے پانی کے تالاب میں کوئی کنکر پھینکے تو اچانک سناٹے کی کیفیت یکایک ختم ہو جاتی ہے اور سطحِ آب میں تلاطم برپا ہو جاتا ہے۔ ویسے ہی یکایک ایک سے سے بڑھ کر ایک قہقہے بر آمد ہونا شروع ہو گئے اور وہ جو ایک خاص کیفیت طاری تھی وہ ختم اور اس کی جگہ قہقہے گونجنا شروع ہو گئے۔ ساری نیم مدہوشی، چُستی اور ہوشیاری میں بدل گئی اور ایک یادگار واقعہ کے طور پر ثبت ہو گئی۔

انھی بھٹی صاحب کا ایک اور نہ بھولنے والا واقعہ کچھ یوں ہے کہ ہم لوگ ایک علاقہ میں پیدل سفر کر رہے تھے۔ باتوں باتوں میں مَیں نے بھٹی صاحب سے کہا کہ یار بھٹی تو خوب ہٹا کٹا ہو گیا ہے اور تیرا وزن بھی بہت بڑھ گیا ہے۔ لگتا ہے کہ تونے کلو گرام کی سنچری مکمل کرلی ہے یہ 100 کلو ہو گیا ہے۔ بھٹی صاحب اپنے مخصوص سٹائل میں بولے، اوئے نہیں اوئے۔ تُو اپنی طرف دیکھ تیرا وزن بھی 100 کلو گرام سے کم نہیں ہے۔ انھی باتوں کے دوران وہاں لکڑی کا ایک ٹال آ گیا جس میں باقاعدہ ترازو لگا ہوا تھا اور ساتھ ہی بڑے بڑے گول مٹول پتھر بطور

باٹ کے پڑے تھے۔ میں نے کہا، بھٹی صاحب ہاتھ کنگن کو آرسی کیا یہ ترازو ہے ابھی دیکھ لیتے ہیں کون سُپر ہیوی ویٹ ہے اور کون ہیوی ویٹ۔ چنانچہ پہلے میرا وزن کیا گیا تو 92 کلو گرام آیا۔ بھٹی صاحب بڑے خوش ہوئے کہ قریشی کا 92 کلو گرام ویٹ ہوا ہے۔ اب جب ان کو پلڑے میں بٹھایا گیا تو ان کا وزن بھی 92 کلو گرام نکلا۔ یوں اللہ نے ہم دونوں کو برابر کر کے ایک دوسرے سے شرمندہ ہونے سے بچایا۔ بعد میں یہ 92 کلو گرام بھی ایک ضرب المثل بن گیا۔

# اختتامیہ

یہ کتاب دراصل ایک اعترافِ حقیقت ہے جب تک اللہ تعالیٰ کی عافیت شاملِ حال نہ ہو انسان لامحدود حد تک انتہائی لاغر اور بے بس مخلوق ہے۔ میں نے اپنی کم مائیگی، کم ہمتی، ناپختہ محدود سوچ اور خستہ مستقبل بینی کی بدولت کافی عرصے تک اپنے ذہن میں یہ بات بٹھائے رکھی کہ آنے والا وقت اور اس کی لگامیں میری مرضی کے تابع ہیں۔ میں ان کو جدھر چاہوں موڑ لوں، جیسا راستہ چاہوں اختیار کروں، مجھے ہر حال میں کامیابی و کامرانی کا منہ ہی تکنا ہے۔ ناکامی میری زندگی کی لغت میں نہیں اور میں ہی وقت کا بلا مقابلہ چیمپئن ہوں۔ یہ میری سوچ مجھے نہیں پتا میرے ذہن میں کیسے پنپ گئی بلکہ چمٹ گئی اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس زمین و آسمان اور ان کے درمیان موجود تمام مخلوقات کے اصل خالق و مالک و مختار اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس چمٹی ہوئی خود غرضی والی سوچ کو کھرچ کھرچ کر میرے دل و دماغ سے صاف کیا اور مجھے اس راستے پر چلایا، پھر اس مقام تک پہنچایا جو اس نے میرے لیے خود پسند کیا تھا اور جو اس کی پلاننگ

تھی، وہ تمام عوامل اس کتاب میں اشارے کنایے سے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یقیناً ہر صاحبِ بصیرت کے لیے اس اعترافِ حقیقت کا سمجھنا قطعاً مشکل نہیں ہے۔

---